بیروں والا فقیر

کشمیری لال ذاکر

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیرسوں والا فقیر

افسانے

کشمیری لال ذاکر

یہ کتاب
ہریانہ ساہتیہ اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی

BERION WALA FAQEER (SHORT STORIES)
KASHMIRI LAL ZAKIR PRICE 25/-

پہلی بار : فروری ۱۹۸۴ء
قیمت : پچیس روپے
کتابت : حفیظ الرحمٰن
طباعت : نعمانی پریس، دہلی
تعداد چھ سو

زیر اہتمام :
پریم گوپال متل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس،
۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲-

دو لفظ

ہریانہ ساہتیہ اکادمی ریاست کے ادیبوں کی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے کام میں مصروف ہے۔ ہریانہ کے ادیبوں کو ہندی، پنجابی، اردو، اور سنسکرت میں اُن کی غیر مطبوعہ تخلیقات کو شائع کروانے کے لیے مالی امداد دی جاتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت جناب کشمیری لال ذاکر کی اس کتاب "بیریوں والا فقیر" کو شائع کرنے کے لیے بھی مالی امداد دی گئی ہے۔ یہ جناب کشمیری لال ذاکر کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے زبان، موضوعات اور اندازِ نگارش ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ اُمید ہے اُردو ادب میں شغف رکھنے والے انہیں پسند کریں گے۔

او۔ پی۔ بھاردواج
ڈائریکٹر
ہریانہ ساہتیہ اکادمی

انتساب

پروفیسر رئیس احمد کے نام

اندرونی صفحات

جستجو ۹

کچھ روز پہلے ٹیلی ویژن سینٹر جالندھر کے اسٹوڈیو میں مجھ سے انٹرویو کرتے ہوئے شمیم عصمت نے سوال کیا تھا:

"ڈاکٹر صاحب، آپ نے اتنی کہانیاں لکھ ڈالیں، اتنے ناول لکھ لیے، کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟"

اس وقت مجھے یاد نہیں کہ ٹیلی ویژن کے اُس لائیو پروگرام میں ایک فوری سوال کے جواب میں کیا کہا تھا میں نے، لیکن شمیم کا یہ سوال بہت دنوں تک مجھے پریشان کرتا رہا۔

آخر ادیب کیوں لکھتا ہے؟

مَیں کیوں لکھتا ہوں؟

ادیب کی کیا مجبوری ہے؟

بحیثیت ایک ادیب میری کیا مجبوری ہے؟

اگر صرف لکھنے ہی کی بات ہے تو دس بیس کہانیاں لکھ کر، دو چار ناول مکمل کر لینے کے بعد اپنا تخلیقی کام چھوڑ دیجیے۔ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ ادیب کیوں لکھتا رہتا ہے؟ اپنا یہ تخلیقی عمل ختم کیوں نہیں کر ڈالتا؟

کسی بھی زبان کا کوئی بھی ایسا ادیب دھیان میں نہیں آرہا جس نے ایک آدھ کہانی یا ایک آدھ ناول لکھ کر اپنا تخلیقی کام چھوڑ دیا ہو۔ اُس کی ایسی کیا مجبوری ہے کہ وہ کسی بھی ایسے موقعے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا جب اُس کے سامنے پلاٹ ہو۔ اپنی تخلیق کا پورا اسکیچ ہو اور وقت کی سہولت ہو اور وہ اپنی کتاب کو مکمل کرنے کی کوشش نہ کرے۔
یہ بات الگ ہے کہ کئی بار تمام کہانی ذہن میں مکمل تھی۔ بس اسے کاغذ پر اُتارنا ہی تھا لیکن وقت نہیں جُٹا سکا۔ کچھ دفتری قسم کی بے کار مصروفیتیں، کچھ سماجی اور ذاتی جھگڑے، بے حد جھنجھلاہٹ بھی ہوئی، کُڑھا بھی بہت، لیکن کہانی نہیں لکھ پایا جب کبھی دوبارہ اُسے مکمل کرنے کا خیال آیا تو ہزار منتوں کے باوجود کرداروں کی ناراضی دُور نہیں ہوتی۔ رُوٹھا ہوا محبوب تو مَن جاتا ہے لیکن آپ کے کردار اگر ایک بار رُوٹھ جائیں تو کبھی نہیں منتے۔ بس یہی ہوا کئی بار میرے ساتھ، کسی ادھوری چھوڑی ہوئی کہانی کو جب دوبارہ لکھنے کی کوشش کی تو وہ دو چار صفحوں سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ دو تین ناول، پچھلے چار پانچ سال سے نامکمل پڑے ہیں، انھیں مکمل نہیں کر سکا۔ حالانکہ اس دوران میں نے اور کئی کہانیاں لکھ ڈالیں۔ تین چار ناول مکمل کر ڈالے لیکن ادھوری تحریریں ادھوری ہی رہیں۔

یہ بات سوچنے کی ہے کہ آخر وہ کون سی مجبوری ہے جو ادیب کو اپنے ناساز گار ماحول اور ناساز گار حالات کے باوجود لکھنے پر اُکساتی رہتی ہے۔ پچھلے چند دنوں میں کئی بار سوچا اس مسئلے پر۔ بات کچھ اس طرح سے سمجھ میں آئی۔

میں دوسرے ادیبوں کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا۔ شاید اُن کی کوئی دوسری مجبوریاں ہوں لیکن میری مجبوری تو فقط اپنی تلاش ہے۔ ایک غیر مختتم اور مسلسل

جستجو جو پل بھر سانس لینے کو تو بھلے ہی کہیں رُک جائے لیکن اپنا سفر ترک نہیں کرتی۔ شاید اپنے آپ کی تلاش ہی میری وہ مجبوری ہے جو مجھ سے کبھی کہانیاں لکھواتی ہے کبھی ڈرامے اور کبھی ناول اور کبھی شعر کہلواتی ہے۔ تلاش کا عمل ایک ہی ہے۔ حرف رُوپ الگ الگ ہیں۔ نہ منزل ہی آئی ہے، نہ تلاش کا سفر ہی ختم ہوا ہے۔ اسی لیے لکھتے رہنے کا پروسیس جاری ہے شاید۔

لیکن کیا کبھی منزل آئے گی؟
کیا کبھی یہ تلاش ختم ہوگی؟
کیا کبھی یہ سفر مکمل ہوگا؟

یہ ایک دوسرا سوال ہے جو کئی اور سوالوں سے جُڑا ہوا ہے۔ اور اُن سوالوں کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اپنے سماج کی دھرتی میں اُتری ہوئی۔ جس دھرتی کی سطح پر غریبی، ناانصافی، احتجاج، محرومی، اور استحصال کی بھرپور فصل ہے۔ جب تک یہ فصل جلا نہیں ڈالی جاتی دھرتی میں گہری جڑیں تلاش نہ ہو سکیں گی۔ اور اس لیے بہت سے سوال بہت مدت تک حل نہ ہوں گے۔ نہ فصل جلے گی، نہ جڑیں ملیں گی نہ سوال ہی حل ہوں گے۔

اور اس دوسرے سوال کا جواب پانے کے لیے بھی مجھے اپنی تلاش جاری رکھنی ہوگی کہ یہ بھی میری مجبوری ہے۔ مجھے ابھی اور کہانیاں لکھنی ہوں گی کہ جو کہانیاں میں اب تک لکھ چکا ہوں، اُن سے مطمئن نہیں ہوں۔ جو ناول اب تک چھپ چکے ہیں اُن سے میری سیٹسفیکشن نہیں ہوئی۔ اپنی تحریروں کی حدود سے مجھے ابھی اپنا سُراغ نہیں ملا۔ کب ملے گا معلوم نہیں۔ میری جستجو کا یہ سفر کب ختم ہوگا، نہیں جانتا۔ شاید کسی بھی فن کار کو اس بات کا علم نہیں کہ وہ کب اپنے آپ کو تلاش کرلے گا۔ چاہے وہ فن کار قلم کا ہو، چاہے رنگوں کا۔ چاہے

آواز کا ہو، چاہے سیلولائیڈ کا اور چاہے فن کے کسی اور شعبے کا! فن کار کی طرح فن کے بھی کئی روپ ہیں۔ تب ہی تو فن کار کو چھلاوے دیتا ہے نئے نئے رُوپ دھار کر۔

کاش، کسی فن کار کو جاننے، پہچاننے اور پرکھنے والے لوگ اس کی اس مجبوری کو بھی سمجھ سکیں! فن کار کی یہی مجبوری تو اُس کے فن کی جان ہے۔

۲۶ سیکٹر ۱۱۱۵ بے
چنڈی گڑھ
۲۶ دسمبر ۱۹۸۳ء

—— کشمیری لال ذاکر

مالابار کی شہزادی

وہ شاید آخری ڈیلیگیٹ تھا جو کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچا تھا۔ کانفرنس کا افتتاح دس بجے تھا اور وہ ساڑھے نو بجے تو گیسٹ ہاؤس میں ہی پہنچا تھا۔ یونیورسٹی میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ نے ڈیپارٹمنٹ کی سبھی لڑکیوں کے ذمے کوئی نہ کوئی ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ لڑکیوں کے مختلف گروپ مختلف کاموں پر مامور تھے۔ ہمارے گروپ کی پانچ لڑکیوں کی ڈیوٹی اس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے والے ڈیلی گیٹس کو کانفرنس کے دوران سہولیات بہم پہنچانے کی تھی۔ اُس کی ٹیکسی جب گیسٹ ہاؤس کے پورچ میں رکی تو اُس وقت میں ہی گیٹ پر موجود تھی۔ میں نے ہی ٹیکسی سے اُس کا سامان نکلوایا اور گیسٹ ہاؤس کے چوکیدار سے کہا کہ وہ سامان کو کمرہ نمبر سات میں لے جائے جو دوسرے فلور پر تھا۔

"سر، آپ کمرہ نمبر سات میں ٹھہریں گے۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا، صرف مسکرایا، اور میں اُسے دوسرے فلور پر لے جانے کے لیے اُس کے ساتھ ہولی۔

اس گیسٹ ہاؤس میں جو بندرہ ڈیلی گیٹ ٹھہرے ہوئے تھے، وہ سب کانفرنس کے پنڈال کی طرف جا چکے تھے تاکہ رجسٹریشن آفس سے کانفرنس کی فائلیں لے لیں۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"کانفرنس کے افتتاح کا کیا ٹائم ہے؟"

"سر دس بجے۔"

"بہت ہی کم ٹائم رہ گیا ہے۔"

"آپ جلدی تیار ہو جائیے۔"

"ناشتے کا کیا انتظام ہے؟"

"بریک فاسٹ تو اولڈ ہوسٹل میں ہے۔"

"یہاں نہیں؟"

"سر نہیں۔"

"یا تو بریک فاسٹ مس کرنا پڑے گا۔ یا اِنا گریشن۔ دونوں کام نہیں ہو پائیں گے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ لگا جیسے وہ کچھ پریشان تھا۔

"چائے مل سکتی ہے۔"

"ہوسٹل سے منگوانا پڑے گی سر۔"

"تو ہمیں گیسٹ ہاؤس کی بجائے ہوسٹل میں ہی کیوں نہیں ٹھہرا دیا؟"

"سر گیسٹ ہاؤس کے بیرہ لوگوں کی ڈیوٹی ہوسٹل میں ہی لگا دی گئی ہے۔"

"تو پہیلی دھر یور ہوسٹل؟"

"اولڈ ہوسٹل سر۔"

"سے بی اولڈ، نیور ینگ" یہ جواب دیتے ہوئے وہ مسکرا دیا۔ وہ پہلی بار مسکرایا تھا۔

چوکیدار نے اس کا سامان کمرے کے اندر رکھ دیا تھا۔

"سامان ٹھیک ہے سر؟"

وہ جواب دینے کی بجائے کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں سے یونیورسٹی کے سامنے بے شمار اونچے اونچے ناریل کے درختوں کا گھنا جنگل تھا اور اس کے پیچھے دور تک پھیلا ہوا سمندر تھا۔ اور اس کی حدوں کو چھوتا ہوا گہرا نیلا آکاش تھا۔

"اے بیوٹی فل سائٹ!" اس نے ایک گہرا لمبا سانس لیتے ہوئے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں مسکرا دی۔

"تمہارا نام؟"

"پاتل پتر۔"

"واٹ از پاتل پتر؟"

"اے فلاور سر۔"

"اے فریش فلاور فرام مالابار۔"

میں اس کے اس ریمارک پر بلش کر گئی۔

"میں اب جلدی سے تیار ہو جاؤں۔"

"یس سر!"

میں کمرے سے باہر آ گئی اور میرے ساتھ تو دیپکا بھی آ گئی۔

جانے کیوں میں نے سوچا کہ اس کے لیے کم سے کم گرم چائے کی ایک پیالی کا تو انتظام کرنا ہی چاہیے۔ میرے گروپ کی سبھی لڑکیاں کانفرنس ہال میں جا چکی تھیں اگر وہ پانچ منٹ دیر سے آتا تو میں بھی ... ہوتی۔ اگر گیسٹ ہاؤس میں کوئی بھی نہ ہوتا تو پتہ نہیں اسے کتنی پریشانی ہوتی اور وہ تھکا ہوا دور سے آیا تھا۔ چنئی گڑھ سے جو یہاں سے ایک ہزار میل سے بھی زیادہ دور تھا اور میں اسے چائے کی ایک پیالی

بھی نہ مل سکتی تھی۔ ناشتہ تو خیر اب وہ نہیں کر سکے گا۔ اتنا وقت ہی کہاں تھا۔ میں تو وہیں
اوپر ہوسٹل میں گئی۔ اسی ہوسٹل میں تیسرا اپنا کمرہ تھا جس میں اب میرے گروپ کی ساری
لڑکیوں نے اپنا اپنا سامان ڈال کر اسے ایک کباڑخانہ بنا ڈالا تھا۔ اپنا کمرہ کھولا۔ اس
میں سے تھرماس نکالا، ہوسٹل کے کچن سے دو پیالیاں چائے منگا کر اس میں ڈالیں اور پھر ایک دم
گیسٹ ہاؤس کی طرف لپکی گھڑی دیکھی دس بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ جب تک
میں پہنچوں گی وہ تیار ہو کر کانفرنس ہال تک جا رہا ہوگا۔ یہی ہوا۔

میں جب چائے کا تھرماس لئے اس کے کمرے کے سامنے پہنچی تو کمرے کا دروازہ
بند تھا اور کنڈی میں تالا لٹک رہا تھا۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔ لگا جیسے اس نے جان
بوجھ کر ایسا کیا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ میں اس کے لئے دوسرے ہوسٹل سے چائے
لینے گئی تھی۔ اور پھر تالے کو دیکھ کر تو مجھے ہنسی آگئی۔ کنڈی میں تالا پڑا تھا لیکن وہ اسے
شاید لگانا بھول گیا تھا۔ کھلا تالا دیکھ کر میں نے کنڈی کھولی اور کمرے کے
اندر آگئی۔ سامان اس طرح بکھرا پڑا تھا جیسے ایمرجنسی کے دوران کوئی ریڈ کیا گیا ہو۔
کوئی چیز کہیں، کوئی کہیں۔ شیو کا سامان بھی ان دھلا ڈش بیسن کی ایک طرف پڑا تھا۔ گیلا
تولیا کرسی کے بازو سے لٹک رہا تھا۔ پیسٹ کی شیشی کھلی پڑی تھی۔ ٹیلکم پاؤڈر ساری
میز پر بکھرا پڑا تھا۔ دیر سے آکر بھی وقت سے پہلے کسی جگہ پہنچنے کی کوشش میں کیا کچھ
ہو سکتا ہے۔ میں یہی سوچتی رہی اور تھرماس کو میز پر رکھ کر جب کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوئی
جیسے ہی دور سے ملی نغمے کی گونج فضا میں لہرائی۔ کانفرنس کا افتتاح ہو چکا
تھا۔ میں نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کو ترتیب سے رکھا۔ شیو کا سامان دھو کر
تولیے سے پونچھ اور گیلے تولیے کو کرسی کے بازو سے اٹھا کر باتھ روم میں پڑے ہینگر
پر ڈال دیا اور پھر کمرے سے باہر آگئی۔ کھلا تالا اسی طرح کنڈی میں ڈال دیا اور کانفرنس
ہال کی طرف چلی گئی۔

"اے فریش فلاور فرام مالابار!" اُس نے کچھ دیر پہلے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا۔

لنچ کے بعد گیسٹ ہاؤس کی طرف بڑھے سبھی ڈیلی گیٹ آرام کرنے کے لیے باری باری اپنے کمروں میں آنے لگے۔ میں گیٹ کے ایک طرف ریسپشن کاؤنٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھی اپنے گروپ کی لڑکی تارا سے بات کر رہی تھی کہ وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس بار بھی وہ سب سے آخر میں آ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے آخر میں آنا اُس کی عادت تھی۔ وہ کاؤنٹر کے قریب سے گزرا تو میں اور تارا دونوں کھڑی ہو گئیں۔

"پلیز ریسٹ ڈاؤن۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ اور دوسرے فلور پر جاتی ہوئی زینے کی طرف بڑھ گیا۔

کانفرنس کے دوسرے سیشن میں جانے سے پہلے وہ کاؤنٹر پر رکا۔ تارا اُس وقت وہاں نہیں تھی۔

"میرے کمرے کا تالا کس نے کھولا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں، سر۔"

"میز پر چائے کا تھرماس کس نے رکھا تھا؟"

"میں نے رکھا تھا سر۔"

"میری چیزیں کس نے سنبھالی تھیں؟"

"سر، میں نے سنبھالی تھیں۔"

"تو تالا بھی تمہیں نے کھولا ہوگا؟"

"نہیں سر، آپ ہی کھلا چھوڑ گئے تھے۔"

اُس نے پل بھر حیران سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"اس کا مطلب ہے میں کبھی امپرزو نہیں کر سکتا۔ ویری سیڈ۔"

میں نے اپنے بارے میں اُس کے کئے ریمارک پر کوئی کومینٹ نہ کیا۔

تمہاری یہ یونیورسٹی تو شہر سے بہت دور ہے۔"

"یس سر۔"

"یہاں سے تو شہر جانا ہی مشکل ہے۔"

"کہاں جانا چاہتے ہیں سر آپ؟"

"کانی کوٹ کی اولڈ پورٹ پر۔"

"میں لے چلوں گی۔"

"کیسے؟"

"بس سے سر!"

"اور واپس کیسے آئیں گے؟"

"بس سے یا ٹیکسی سے۔ ایزیلائیک سر۔"

"تو پانچ بجے چلیں گے۔"

"او۔کے۔"

میرا جواب سن کر وہ مسکرایا اور پھر اپنی خاموش اونگھتی ہوئی سی چال سے کانفرنس ہال کی طرف چلا گیا۔

شام کو جب ہم اولڈ پورٹ پر پہنچے تو سورج غروب ہونے کو تھا۔

"واسکوڈے گاما نے یہیں لینڈ کیا تھا کیا؟"

"نہیں سر، وہ دوسری جگہ ہے۔ یہاں سے کوئی پندرہ میل دور۔ اُس جگہ کا نام کاپڈ ہے۔"

"آئی سی، ہم وہاں نہیں جا سکتے؟"

"دوسرا"

"کانٹ یو اسٹاپ دس سرسراتا ہوا پور۔" اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"یو ڈونٹ لائک اِٹ؟"

"ناٹ ایٹ آل۔"

اس کے بعد میں نے اُسے یہ کہہ کر مخاطب کرنا چھوڑ دیا۔

وہ میرا ہاتھ تھامے دور تک ساحل کی ریت پر گھومتا رہا خاموش بیٹھ کر ہم ابھی لہروں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ سمندر میں دور مچھیروں کی کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ پھر اس نے میری کچھ تصویریں اتاریں اور پھر خشک ریت پر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا۔

"تم یہاں سے ملنے چلی آئی تھیں تو مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"آپ کانفرنس ہال میں جا چکے تھے۔"

"مجھے جانے سے روکا کیوں نہیں تم نے؟"

"میں کیسے روک سکتی تھی؟"

"جیسے مجھے یہاں لائی ہو۔ اس اسنڈلورسٹ کے ساحل پر جہاں کسی زمانے میں ہندوستان کی تاریخ کو اچانک ایک نیا موڑ ملا تھا۔"

پل بھر کو خاموش رہ کر وہ بولا۔

"تم کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"ترچور کے ایک گاؤں کی جہاں ناریل اور کاشو نٹ کے بڑے گھنے کھیت ہیں۔"

"تو یہیں اُگتے ہیں مالابار کے پھول؟"

"وہ تو سارے مالابار میں اُگتے ہیں۔" میں مسکرائی۔

"تم میرے لئے مالابار کی شہزادی ہو جو مجھے کالی کٹ کے ساحل پر ڈوبتے سورج کی کرنوں میں ملی ہے۔"

"میں تمہیں سلام کرتا ہوں مائی لو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑی دیر تک سہلاتا رہا اور پھر اندھیرا ہونے لگا اور سمندر میں دور دور گئے ہوئے مچھیروں نے اپنی کشتیوں میں روشنیاں جلالیں۔

جب ہم یونیورسٹی کیمپس میں پہنچے تو وہ ہی گیسٹ ڈنر کے لئے اولڈ ہوسٹل میں جا رہے تھے وہ بھی اولڈ ہوسٹل میں چلا گیا اور میں گیسٹ ہاؤس میں آگئی۔

رات کو کچھ پتہ نہیں کب ڈنر ختم ہونے کے بعد جب کوئی بارہ بجے کے قریب وہ گیسٹ ہاؤس میں لوٹا تو میں کاریڈور میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟"

"آپ کا انتظار کر رہی تھی!"

"جاؤ اب سو جاؤ۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ!"

وہ دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھ گیا اور میں وومن ہوسٹل کے اپنے کمرے میں آگئی۔ تارا نے مجھ سے پوچھا کہ میں شام کہاں گئی تھی تو میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

"لیکن وہ تو یہاں صرف دو دن کے لیے ہے!"

"مجھے معلوم ہے تارا!"

"پھر؟"

"پھر وہ کالی کٹ سے چلا جائے گا۔ لیکن میرے دل میں اس کی یادوں کے چراغ جلتے ہیں سمندروں کے گہرے نیلے پانیوں میں۔"

تارا مجھے بہت دیر تک سمجھاتی رہی اور میں اتنی دیر تک ہی اپنے ذہن کے کواڑوں

کو بند کر کے کھلی آنکھوں سے اُس کی باتیں سُنتی رہی۔

کانفرنس کے بعد یونیورسٹی میں ایک ہفتہ کی چھٹیاں ہو رہی تھیں مجھے تارا کے ساتھ اپنے گاؤں جانا تھا اور وہ کانفرنس کے بعد کنیا کماری جانا چاہتا تھا اور پھر وہاں سے واپس آکر اُس کا چنڈی گڑھ جانے کا پروگرام تھا۔

"تم میرے واپس آنے تک یہاں نہیں رکو گی؟" اُس نے پوچھا تھا۔

"مجھے اپنے گاؤں جانا ہے۔"

"تو جاؤ۔ میں تمہارا دیا ہوا کاشبو نٹ کے ننھے ننھے گلابی پھولوں کا گچھا اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تمہارے اُس لوک گیت کی لائینیں یاد کر لیا کروں گا جو تم نے کل شام سُنایا تھا۔ کیا لا سترتیمیں دہ؟ سُناؤ گی نہیں ماتیل پُو؟"

اُس کی بات سُن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے اپنی اشک بھری آنکھوں اور لرزتی آواز سے اُسے وہ ملیالی لوک گیت سُنایا جو اُسے بہت پسند تھا۔

"ماتیل پُو، تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر اُس کے سینے سے لگی روتی رہی۔

"میں تارا کے ساتھ گاؤں نہیں جاؤں گی۔ یہیں ویٹ کروں گی آپ کا۔ کنیا کماری سے واپس آنے تک۔"

اور اُس نے میری گیلی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور میں مسکرا دی۔

اُسی شام وہ کنیا کماری چلا گیا۔

اور اُس سے اگلی صبح ہوسٹل کی بھی لڑکیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ تارا بھی چلی گئی جو میرے ہی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ لیکن میں نہیں گئی۔ میں اُس کا انتظار کرتی رہی۔

تین روز کے بعد وہ واپس آگیا اور گیسٹ ہاؤس پہنچتے ہی مجھ سے ملا۔

"میں آپ کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ گاڈ واز نیس گی۔"

"شکریہ۔" اُس نے مسکرا کر کہا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔
اُس کے ساتھ کچھ فارنرز تھے جو کینیا، ٹمارک ہی سے اُس کے ساتھ کالی کٹ آگئے تھے۔
اُن میں ایک خوبصورت، پتلی سی، بھورے بالوں والی امریکی لڑکی بھی تھی۔ بے حد بڑی چارمنگ تھی وہ۔

"شی از دی پرنسس آف مالابار۔" اُس نے میری طرف اشارہ کر کے اس امریکی بی بی سے میرا تعارف کرایا۔

"آف کورس!" اُس نے میری طرف بڑے پیار سے مسکرا کر دیکھا۔ میں بھی مسکرا دی۔
اور پھر وہ ان سب کو گیسٹ ہاؤس میں لے گیا اور دیر تک اُن سے باتیں کرتا رہا۔
میں اُس کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا۔

"یو آر ہیر؟"

"یس۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے ان لوگوں کے ساتھ واسکوڈے گاما کی لینڈنگ پلیس تک جانا ہے۔ دیر میں لوٹوں گا اور پھر شاید کل صبح انہی کے ساتھ بنگلور چلا جاؤں گا۔"
وہ اتنی جلدی سب کچھ کہتا جا رہا تھا کہ میں کچھ بول ہی نہ سکی۔

"واٹ شڈ آئی ڈو؟"

"گو ہوم۔ تمہارے لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے کس سکون سے یہ بات کہہ دی تھی۔
اتنے میں وہ امریکی چارمنگ لڑکی اُسے آوازیں دیتے ہوئے اسی کے کمرے میں آگئی۔

"جوشی کم، لیٹ آل دی برنڈی لے آؤ رز۔"
اور اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنے قریب کر لیا۔ اُسے جس کا نام جوشی

آپ کو مالا بار کی شہزادی سمجھ بیٹھی تھی۔ باتوں اور خوابوں کے تانت میں ٹنکے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیاں لہروں میں بکھر رہی ہیں اور مالا بار کی شہزادی با نام گاؤں کی ایک معمولی سی دیہاتی لڑکی کے روپ میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی ناریل کی لکڑی کے بنے ہوئے کمرہ سے کیا میرے دل میرے ذہن پر دستک دے رہی ہے، اور گھر کے اندر ایک مدھم سا چراغ جل رہا ہے ویسا ہی ایک چراغ جو دور لہروں پر جھومتے ہوئے کسی مچھیرے کی کشتی میں جل رہا ہے اور جو چار دن پہلے میرے دل کے آنگن میں بھی جلا تھا۔

ہوا اچانک تیز ہو گئی ہے۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا ہے اور کشتیوں میں جلتے ہوئے چراغ ہوا کی لہروں میں تھر تھرانے لگے ہیں اور میں سوچ رہی ہوں کہ جو لوگ پہلی ہی ملاقات میں کسی کے اپنے بن جاتے ہیں وہ کتنے ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔

پرواز کے زخم

میں ابھی ابھی اس کے گھر سے لوٹ کر آیا ہوں اور اپنے کمرے میں بیٹھا
سگریٹ پی رہا ہوں۔ پردوں کے کارن کمرے کا ماحول کچھ سلگا سلگا سا ہے اور اس
میں سگریٹ کے دھوئیں کی ننھی سی لکیریں عجیب ڈھنگی پن سے ایک دوسرے میں
خلط ملط ہو رہی ہیں۔ سامنے تپائی پر رکھی ایش ٹرے میں ادھ جلا سگریٹ ابھی
تک سلگ رہا ہے۔ میں سگریٹ کو مسل کر اس کی ہستی نہیں مٹاتا، اسے زندہ رہنے
دیتا ہوں اور اس کے آخری حصے پر میرے ہونٹوں کے نشان سوئے رہتے ہیں اور
اس میں سے ہلکا سا لرزتا ہوا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔ میں اسے سلگنے دیتا ہوں۔
جب تک وہ خود نہیں بجھ جاتا۔

مجھے ایک دم بجھ جانے سے سلگ سلگ کر تڑپ تڑپ کر دھک دھک
کر دھیرے سے بجھنا پسند ہے۔ اس طرح ارتقاء کی سب منزلیں طے ہوتی ہیں۔ درمیانی
منزلیں طے کیے بغیر آخری منزل پر پہنچ جانا تو ایسا ہے جیسے کوئی پرندہ پہاڑ کی چوٹی سے
اڑ کر ایک دم آسمان کی بلندی کو چھو لینا چاہے اور وہ اس کے پنکھ ٹوٹ جائیں تو
اسے زمین کی پستیاں بھی قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ یہ اتنا کچھ تاثر میرے ذہن
میں ابھرا ہے آج نشان کو دیکھ کر۔

نیناں کو میں ۱۹۴۷ء سے جانتا ہوں جب بٹوارے کے بعد میں اس شہر میں آیا تھا۔ ان دنوں وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اب بی۔ اے کر چکی ہے۔

ان دنوں وہ جیسے پھول میں چھپی ہوئی کلی تھی اب پودے کے عین اوپر کھلا ہوا پھول ہے۔

غالباً نومبر کا مہینہ تھا۔ ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ شروع تھے۔ میں دن بھر کرکٹ کھیل کر اور آخر میں ہار کر گھر لوٹا تھا۔ ہار کا تلخ احساس ذہن میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا اور جسم میں تھکن کے کارن درد ہونے لگا تھا۔ میں گھر پہنچتے ہی بستر پر گر گیا اور آنکھیں بند کر کے دنیا بھر کے کھیل کے متعلق سوچنے لگا۔

"بھائی جان کھیل آئے میچ؟" شاردا مجھے بھائی جان ہی کہہ کر پکارتی ہے۔ بھیا نہیں کہتی۔ اسے یہ انداز پسند ہے۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ شاردا میرے سرہانے بیٹھ گئی۔

"ہار گئے نا؟" اس نے مجھ سے اس انداز سے پوچھا جیسے اسے پہلے ہی یقین ہو کہ میں ہار جاؤں گا۔ "تم [illegible] یہ کہنا چاہتی ہو [illegible] بھائی کسی بھی کھیل میں کبھی نہیں جیتا۔"

"ہاں!"

"تو [illegible]" شاردا نے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا اور میں نے اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی انگلیوں [illegible] ٹھنڈک [illegible] محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکرا دی۔ [illegible] جب [illegible] مسکراتی ہے اور اس کی معصوم اور بے لوث مسکراہٹ سے شکست کی چبھن ایک دم مٹ جاتی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"چائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چائے تیار رکھی ہے میرے کمرے میں [illegible] ایک [illegible] بھی ہے اس

ستائے۔" شاردا نے جواب دیا۔

"لیکن میں نے تو منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا۔"

"کونسا حرج ہو رہا ہے جا رہے ہیں آپ" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا "کسی وقت تو حد کر دیتے ہیں آپ۔ یوں چاہیے دن بھر آئینہ ہی دیکھیں بس۔"

"چلیے بھئی۔" میں نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا میں جانتا تھا وہ کیا کہے گی۔

کمرے کا پردہ اٹھا کر اس نے اندر قدم رکھا اور اس کے پیچھے میں داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ یوں اٹھ کھڑی ہوئی جیسے کوئی ہرنی اچانک قریب آہٹ پا کر ڈر جائے۔

"نیناں۔"

"بھائی جان۔"

نیناں نے بھر بھر کے پلکیں اوپر اٹھائیں جیسے جھیل کے گہرے نیلے پانی پر بھونرا [illegible] ہم [illegible] اپنی بھرپور [illegible] سے جاگا ہوا اور پھر فوراً ہی اس نے پلکیں جھکا لیں جیسے کسی نے صبح کا راستہ روک کر [illegible] ہو اور جھیل کا پانی ساکن ہو گیا ہو اور اس کی سطح پر رات کے سائے لہرانے لگے ہوں۔

کمرے میں دو کرسیاں تھیں۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ شاردا کا پلنگ تھا جس پر سفید رنگ کی چادر بچھی تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی میں نے کرسی لے لی۔ میں اور نیناں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں تپائی تھی۔

"نیناں بڑی اچھی کہانیاں لکھتی ہے بھائی جان۔" شاردا پیالیوں میں چائے کا پانی ڈال رہی تھی۔

"تو آپ ہماری برادری کی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی!" نیناں کی پلکوں میں خفیف سی لرزش ہوئی وہ ذرا سا اوپر اٹھیں جیسے جھیل کے

پانی پر دونوں وقت گلے مل رہے ہوں۔ صبح شام کے بازوؤں میں بکھر کر مسکرا رہی ہو۔

"جب بھی اس وادی میں کوئی قدم رکھتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔"

"یہ بیچاری قدم کہاں رکھ رہی ہے۔" شاردا نے میری بات ٹوک دی۔

"راستے چلتا پنچھی قافلے میں شامل ہو جاتا ہے بھئی۔ کسی نہ کسی موڑ پر تو دوسرے مسافر مل ہی جاتے ہیں جیسے آج میں مل گیا ہوں۔"

میری بات سن کر نینا کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں جیسے ساگوان کے گھنے جنگلوں میں سوئی شبنم کے سینے پر کھلی دھوپ چٹکنے لگی ہو اور اپنی نرم نرم کرنوں سے اسے گدگدانے لگی ہو اور ساری خوابیدگی، سارا آلکس، ساری نیند کھرچنے لگی ہو اور پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ تمام جنگل پر اندھیرا چھانے لگا اور دھوپ سمٹنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گھنا اندھیرا بھر گیا۔ نینا کی آنکھوں میں بے پناہ غم جھانک اٹھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں چائے کی پیالیوں پر گاڑ دیں۔ شاردا پیالیوں میں دودھ ڈال رہی تھی اور بھول گئی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی گفتگو چل رہی تھی۔

"بھائی جان آپ یہ پیالی لے لیں۔" اس نے نینا کے آگے پڑی ہوئی پیالی میری طرف سرکا دی اور میری پیالی اس کے آگے کر دی۔

"یہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"نینا کو بالائی پسند نہیں۔ یہ تو چائے میں دودھ بھی چھان کر ڈالتی ہے۔" اس کی پیالی میں بالائی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے۔

"اچھا!"

"ہاں۔ گھر میں اس کا اکثر اس بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے۔" شاردا نے کہا۔

"بڑا آرٹسٹک نظریہ ہے۔" میں نے چائے میں چمچہ گھماتے ہوئے کہہ دیا۔

شاردا تیناں کی پیالی میں شکر گھول رہی تھی۔

"چائے میں شکر بھی خود نہیں گھولتی کمبخت، ہر کام اسے کرا دینا چاہیئے۔" شاردا نے پیار سے اس کے گال کو چھو لیا۔ تیناں ایکدم جیسے جاگ گئی ہو۔

"سو رہی تھیں آپ؟" میں ہنسا۔

"جی نہیں..." وہ ذرا سا مسکرائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار دانت چمک اٹھے پر اس مسکراہٹ میں ایک کسک سی تھی، جیسے درد کی ایک ہلکی سی لہر اس کی نس نس میں پھیل گئی ہو۔ اس کے چہرے پر زردی سی ابھر آئی تھی اور آنکھوں کا اندھیرا دو چند ہو گیا تھا جیسے کسی وادی میں کھڑی کوئی پہاڑ کی چوٹی ہو جس کے ایک طرف تو سورج کے ڈھلتے پرکاش سے اُجالا ہے، دوسری طرف اندھیرا پھیل گیا ہو۔

کچھ دیر ہم تینوں خاموشی سے بیٹھے چائے پیتے رہے اور اس کا چہرہ دھیرے دھیرے اپنی نارمل حالت پر آ گیا۔

"کون سے مضمون لے رکھے ہیں آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

"سائنس اور میتھے میٹکس۔"

"بڑا مشکل کمبینیشن ہے، ڈاکٹری کورس کا ارادہ ہے کیا؟"

"خیال تو ہے!"

"آپ بھی تو ڈاکٹر ہی بننا چاہتے تھے نا بھائی جان؟"

"ہاں؟"

"اور بن گئے افسانہ نگار، شاید سبھی لکھنے والے پہلے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔" شاردا بڑے خلوص سے مجھ پر چوٹ کر رہی تھی۔

"میرے خیال میں ڈاکٹر ایک بہترین ادیب بن سکتا ہے۔ انسانی جسم اور ذہن کی ایک ساتھ واقفیت تو انسان کو زندگی کا مکمل بدھ بنا دیتی ہے۔ ادیب بھی ایک طرح

کاذائقہ ہے جو تھکے ہوئے بیمار ذہنوں کو تازگی اور صحت دیتا ہے۔ شکستہ اور ناامید لوگوں تک کو زندہ رہنے کا پیغام پہنچاتا ہے۔"

نینا نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور میری طرف دیکھنے لگی جیسے وہ خود بھی یہی کچھ سوچ رہی تھی لیکن سوچ کی شکل نہ واضح اور مکمل نہ تھی اور وہ اس لئے خاموش تھی اور نہ بولتی نہ تھی۔ میں نے جیسے اس کے من کی بات کہہ دی تھی اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتار دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ایک پیاری سی مسکراہٹ چھا گئی۔ ایک لطیف سی آسودگی۔

"تم ڈاکٹر بنوگی یا لیڈی مکینک؟" شاردا نے اس سے پوچھا

"جو زندگی بنا دے گی۔" یہ شاید پہلا مکمل جواب تھا۔ جو نینا نے دیا تھا۔

اتنی چھوٹی عمر میں ہی اس نے شاید حالات کے تندھتوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ زندگی نے اس سادہ بھولی کلی کی پنکھڑیوں سے اور کبھی شاید کانٹوں کا گھیرا ڈال دیا تھا یا وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ کچھ کلیاں پھول بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور کچھ پھول کھل کر بھی شگفتہ نہیں رہ سکتے ہیں۔

اس کے ذہن کی عجیب ملی جلی کیفیت تھی جیسے دھوپ اور چھاؤں، پرواز اور شکستگی، تصویر کا اسکیچ ہو مگر مکمل تصویر نہ ہو۔

اور تصویر مکمل ہونے میں خاصا وقت لگا۔ بہت دنوں تک میرے سامنے وہ اسکیچ ہی پڑا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

نینا کے چچا یہاں کے ایک بہت بڑے وکیل ہیں، اکثر قتل کے مقدمے لیتے ہیں۔ سول کیسز سے انہیں کم دلچسپی ہے۔ قتل کا مقدمہ ہار جانا سول کے دس مقدمے جیتنے سے بہتر ہے۔ کچھ اس طرح کا خیال ہے انہیں وکالت کے بارے میں۔ کوئی دس ہزار کے قریب ان کی پریکٹس ہے۔ یہ ضلع کافی پسماندہ ہے اور لوگ اپنا بہت سا وقت

لڑائی جھگڑوں میں ہی بتاتے ہیں۔ پانچ ہزار سے جو میعاد میں رہتے ہیں وکیل صاحب کے
خاص بھگت ہیں۔ ان کی کوٹھی شہر سے باہر جیمبر جانے والی سڑک کے کنارے ہے۔ معلوم
ہوتا ہے یہ جگہ انھوں نے کسی مقدمے ہی میں حاصل کی ہے۔ ورنہ اتنے وسیع احاطے
میں تو ایک محل بن سکتا ہے۔ لیکن انھوں نے ایک مختصر سی کوٹھی بنانے پر ہی اکتفا کی
ہے اور جو رات اور دن اس پر کام کرتے رہتے ہیں شاید وہ بھی کسی مقدمے میں پھنسے
ہوئے تھے ورنہ جنھوں نے پوری اجرت لے کر کام کیا ہے وہ صاحب سے دور ہی رہتے
نہیں کرتے۔ پہلی بار جب صبح کو سیر جاتے ہوئے میں ان کی کوٹھی کے قریب سے گزرا تو
وکیل صاحب کا بورڈ پڑھ کر رک گیا۔ تو یہ تھا نیتا جی کا گھر۔ اچھا خاصا محل اب
رہا تھا۔ مختصر سی تھی تو یوں لگ رہی تھی جیسے کسی بڑی سی عمارت میں سائیسوں کے گھر
کو اتر رہے ہوں اور کوٹھی کے آگے مثلاً حامد جیسے گھوڑوں کو سر دونے کا کام آتا ہو۔
کچھ آتی پتلی پتلی سی رضائیاں اوڑھے پھاٹک سے باہر نکل رہے تھے۔ شاید یہ وہی
سپاہی تھے جن کے سہارے وکیل صاحب کی پریکٹس چل رہی تھی۔ وہ صبح صبح رفع
حاجت کے لیے باہر جا رہے تھے۔ رات انھوں نے سردی میں گزاری تھی۔ شاید آج
ان کی عدالت میں پیشی ہے۔ میں آگے قدم بڑھانے لگا تو کوٹھی سے ایک صاحب
باہر نکلے۔ خوب بڑھی ہوئی توند، سر بالکل منڈا ہوا اور گھٹنوں سے ذرا نیچے تک
چڑھی ہوئی دھوتی۔ میرا ذہن یہ گوارا نہ کر سکا کہ میں انھیں وکیل صاحب سمجھوں پر تھے
وہ وکیل صاحب ہی، جن سے میرا اس دن تعارف ہوا جب میں اور شاردا نیتا جی کے
ہاں جانے پر گئے تھے۔

"تمہاری سہیلی کی کوٹھی کیسی ہے شاردا؟" میں نے کوٹھی کے اندر داخل ہوتے
ہوئے کہا۔

"نیتا جی کے پتا جی پرانے خیالوں کے آدمی ہیں۔ وہ اس طرف کم ہی دھیان دیتے

ہیں۔" شاردا نے جواب دیا۔

"اتنا بڑا احاطہ گھیرنے کا فائدہ؟ اس میں تو ایک رفیوجی کیمپ کھل سکتا ہے۔"

"آپ ہمیشہ الٹی ہی باتیں سوچیں گے۔"

"اگر ذاتی جائداد کو اس بُری طرح ہی استعمال میں لانا ہو تو اسے کسی کی ملکیت قرار دے دینا چاہیئے۔" میں نے کہا۔ پھر وہاں رکنے کی ضرورت محسوس کی۔ ایک طرف بنی ہوئی گوبر میں لت پت بھینسوں نے اچھا خاصا گھمسان مچا رکھا تھا۔

اسی وقت نیتاں اندر سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے پاؤں سے حلقے میں دھول کے بادل اٹھ کھڑے ہوئے۔

"نمستے بھائی صاحب!" اور پھر اس نے شاردا کو اپنے ساتھ چمٹا لیا اور دونوں ہنسنے لگیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور دھول میرے سوٹ پر جم رہی تھی۔ کمبخت کو آج ہی ڈرائی کلین کرا کے پہنا تھا۔

نیتاں ہمیں ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں سے گزارتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ ہال کمرے میں سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ ان کا ڈرائنگ روم ہے اور اس میں شام کا سرمئی اجالا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر غالباً ایک دری بچھی تھی۔ دیواریں بہت اونچی اور خالی تھیں اور ان پر کہیں کوئی پرانا کیلنڈر بھی نہ تھا۔ جس چھوٹے سے کمرے میں ہم آئے وہ خاصا اچھا تھا۔

"یہ نیتاں کا کمرہ ہے بھائی جان!" شاردا نے مجھے مخاطب کیا۔

"کمرہ نہیں یہ میری پناہ گاہ ہے۔" نیتاں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے محسوس کیا کچھ روز پہلے جو ہرنی میری آہٹ پا کر چونکی تھی وہ واقعی زخمی تھی اور اس کے سینے میں گہرا گھاؤ تھا۔

کتابوں کو دیکھ چکنے کے بعد پھر تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک جوان سی لڑکی جس کا
ماتھا کشادہ اور ہموار تھا، بڑی ذہین طرح پر اتنی اچھی طرح کیسے کھنچ سکتی ہے۔ اس
کی شخصیت کو ابھارنے میں ضرور کسی دوسرے شخص کا ہاتھ ہے۔ میں ایک نئی الجھن میں
پھنس گیا اتنے میں نیناں کمرے میں داخل ہو گئی۔

"چائے آ رہی ہے! ارے آپ میری کتابیں دیکھ رہے ہیں!"

"ہاں بغیر تمہاری اجازت کے۔" میں نے جواب دیا۔

"جن کے دل میں میرا احترام گزر رہا ہے وہ اجازت لینے کے قائل نہیں۔ وہ
تو سیدھے خط تاک اٹھا کر پڑھ لیتے ہیں اور محسوس نہیں کرتے کہ یہ رویہ غلط ہے۔"
اس کی آنکھوں میں پھر ایک دم ایک اندرونی سایہ آگیا۔ کتنی بیزار تھی اپنے ماحول
سے وہ۔ اس نے الماری کی چابی مجھے دی اور میں الماری کھول کر کتابیں دیکھنے لگا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"نیناں یہ سب کتابیں تم نے خریدی ہیں؟"

"نا نہیں۔ بہت سی کتابیں میرے بھائی صاحب بھیجتے رہتے ہیں۔"

"کہاں ہیں تمہارے بھائی صاحب؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا انہیں۔" شاردا
نے پوچھا۔

"دو برس سے الٰہ آباد میں وکالت کر رہے ہیں بہت دنوں وہ اس ماحول میں
گھٹتے رہے اور آخر اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہیں رہتے ہیں کبھی سال ڈیڑھ سال
میں ایک دن کے لیے یہاں آ جاتے ہیں۔"

"کبھی آئیں تو مجھے ملانا۔" شاردا نے کہا۔

"ہو سکے تو مجھے بھی۔" میں نے کہا۔

مجھے تعجب ہوتی ہے شاردا کو دیکھ کر جسے آپ جیسا بھائی ملا ہے اور جو

زندگی کا ہر لمحہ اس کے ساتھ گزار سکتی ہے۔

"شاردا تو مجھے ہر وقت کوستی ہے۔"

"بہنیں کوسا نہیں کرتیں دعائیں دیا کرتی ہیں بھائی صاحب! اور جب ان کے پاس دعائیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ آنسو بھی بھینٹ کر دیتی ہیں۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسوؤں کی نمی ابھر آئی تھی۔ یہ نمی گواہ تھی اس محبت اور عقیدت کی جو اسے اپنے بھائی سے تھی۔

اس کا بھائی بھی اس دھندلے احاطے میں گھستا رہا اور جب ان بگولوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہار گیا تو بھاگ گیا۔ اس نے گرم چائے کا ایک گھونٹ پیا اور پھر کہنے لگی۔

"یہ کمرہ بھی انہی کا ہے۔ جاتے ہوئے مجھے دے گئے تھے۔ جب یہاں آتے ہیں تو اسی کمرے میں رہتے ہیں۔ رات دن ہم دونوں یہاں اس کمرے میں پڑے رہتے ہیں۔ احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے علاوہ کوئی اور دنیا بھی ہے۔ دنیا سے اس طرح کٹ جانے میں کتنا آنند ہے۔"

نیتا کے ہونٹوں سے ایک طویل آہ نکل گئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے دھندلے دائروں میں سورج کا پیلا اجالا چھننے لگے۔

شاردا اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس سے پہلے اس انداز میں اس نے کبھی باتیں نہ کی تھیں۔

"ٹھہریئے میں آپ کو بھائی صاحب کی تصویر دکھاتی ہوں۔"

وہ کرسی سے اٹھی اور الماری سے کتابوں کے اوپر رکھی ایک تصویر اٹھا لائی۔ اس کے فریم کو کھول کر اس نے اپنی تصویر کے پیچھے سے ایک تعویذ نکالا۔

"دیکھئے یہ ہے ان کی تصویر۔" اس نے تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

جب میں اور شاردا اس کے گھر سے واپس آئے تو ہم دونوں اداس تھے۔
بہت دیر خاموش چلتے رہے جیسے دونوں کے دلوں پر بہت بڑا بوجھ پڑا ہو۔
اس کے بعد میں کبھی بنتان کے گھر نہیں گیا۔ اس نے مجھے کبھی بلایا بھی نہیں۔
شاردا اکیلی ہی جاتی تھی۔ خود وہ ہفتے میں ایک آدھ بار ہمارے ہاں آجایا کرتی
تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنی کہانی بھی لے آتی۔ کہانی سناتے سناتے وہ اس میں اسقدر
کھو جاتی کہ کئی دفعہ اسے ہماری موجودگی کا بھی احساس نہ رہتا۔ میں جب کبھی سیر کے لیے
جاتا تو اس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے محسوس کرتا جیسے ہوا کے بگولے اس
گھر کی کھڑکی سے ابھر کر عجیب سی شکلیں ڈھلتے ہوں۔ اس کے پتا کبھی کبھار دکھائی پڑ جاتے
لیکن وہ مجھے پہچانتے ہی نہیں تھے۔ لمحہ بھر کی ملاقات پہچاننے کے لیے کافی بھی نہ تھی۔
میری واقفیت بنتان سے بڑھ کر اس کے گھر والوں تک نہ پہنچ سکی۔ البتہ بنتان کو
میں زیادہ سے زیادہ پہچانتا گیا۔ اس کی شخصیت اپنی ساری جزئیات کے ساتھ میری
سمجھ میں آنے لگی۔

اس کی اکثر کہانیوں میں ایک ادھورے پن کا سا احساس ہوتا تھا جیسے وہ
کہانی کو انگلی پکڑے ہوئے کسی بازار میں سے گزر رہی ہو اور بھیڑ کے ریلے میں اچانک
اس کا ہاتھ چھوٹ گیا ہو اور کہانی کہیں گم ہو گئی ہو اور وہ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود اسے
نہ پا سکی ہو اور اس کے انداز میں ایک جھلاہٹ، افسردگی اور شکستگی سی بھر گئی ہو۔ یوں
لگتا تھا جیسے کہانی کو لکھتے لکھتے وہ اسے اچانک کسی جگہ چھوڑ دیتی ہے۔ ایک
عجیب سی حسرت اور تشنگی سی رہ جاتی تھی اس کی کہانیوں میں اس کے کردار عام زندگی
کے کردار نہ ہوتے تھے۔ وہ ان کا انتخاب دھرتی سے نہیں آکاش سے کرتی تھی۔
آکاش اس کے سامنے سب سے پہلی چیز تھی۔ وہ تخیل کے پنکھوں پر اڑتے ہوئے دھرتی

سے بہت دور فضا میں پرواز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس لئے اس کی کہانیوں کے
کردار اپنے بھرپور خلوص کے ساتھ بھی بے جان رہتے تھے۔ ان میں حرکت آمیز
زندگی نہ ہوتی تھی۔ ایک ٹھٹھرن اور منجمد قسم کی کیفیت تھی۔ گرمی اور حلیت بھی
نہ تھی۔ ایک بے دلی اور اکتاہٹ سی تھی۔ میں نے اسے کئی بار کہا بھی کہ فن کار کو
اپنی ذات سے باہر نکل کر اپنے ارد گرد کے ماحول کو گہری نظروں سے ٹٹولنا چاہئے۔
جو کردار اسے وہاں سے ملیں گے وہ زیادہ جاندار اور زندگی آمیز ہوں گے۔ پر یوں
نظر آتا تھا جیسے وہ مجبور ہو گئی تھی۔ اس کا ایک زاویۂ نگاہ بن چکا تھا اور اس کا بھائی
اس سے سینکڑوں میل دور رہتے ہوئے بھی اس زاویۂ نگاہ کو پختہ کئے جاتا تھا۔ کاش اس
کے نزدیک کوئی ایسا شخص ہوتا جو اسے اپنے ماحول کے کھردرے پن سے بچنے کے
لیے تخیل کی بھول بھلیاں میں بھٹکنے کی بجائے حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں پر چھوڑ دیتا جہاں
ہواؤں کے تیز تیز ریلے اس سے ٹکراتے اور ٹیڑھی میڑھی تنگ و ترش پگڈنڈیاں اسے اپنی
حفاظت خود کرنے پر مجبور کرتیں۔

پر ایسا نہ ہوا اور وہ اپنی ہی راہ پر چلتی رہی اور اس کی کہانیوں میں حسرت اور افسردگی
بڑھتی گئی اور اس کی آنکھوں کی گہرائیاں زیادہ پُراسرار اور خاموش ہوتی گئیں۔ اس کے ہونٹوں کی
مسکراہٹ میں معصومیت کی جگہ زہر خند نمایاں ہونے لگا۔ وہ زندگی کے اس موڑ
پر پہنچ گئی تھی۔ جہاں اسے محبت اور خلوص کی شمع کی ضرورت تھی۔ ایک بھائی کی نہیں ایک
محبوب کی محبت۔ ایک ایسے شخص کی محبت جس کی آغوش میں اس کی شخصیت کا ہر پھول
کھل جائے، اس کے ہونٹوں سے یاقوت دہک سکیں اور رخساروں کے پھول مہک
اٹھیں اور اس کے ماحول میں ایسی کوئی ہستی نہ تھی۔ اس کے گھر کے باہر ایک اونچی
دیوار تھی جسے کوئی نہ پھلانگ سکتا تھا۔ اس کا تخیل اسے جن جزیروں میں لے جانا چاہتا
تھا وہ بہت دور تھے اور ان کے ارد گرد بہت گہرا پانی تھا جس میں اترنا اس کے بس میں

ہے۔ میں اسے شادی پر کچھ بھی بھینٹ نہیں کر سکا۔ شاردا کا خیال تھا کہ مجھے ضرور کوئی تحفہ دینا چاہیئے۔ بہت سوچنے کے بعد مجھے خیال آیا، مرقع چغتائی، اس کی الماری میں نہیں۔ یہ کتاب اس کے بھائی نے اسے بھینٹ نہیں کی، میں ہی کر دوں۔ میں نے اپنی کتابوں میں سے اسے نکالا۔ یہ کتاب مجھے بے حد عزیز تھی اسے کبھی کبھار ہی الماری سے نکال کر پڑھتا تھا۔ سوچا یہی نیناں کو دے دوں وہ ضرور پسند کرے گی۔ میں اور شاردا، مرقع چغتائی لے کر اس کے گھر گئے۔ میں باہر کھڑا رہا، اس کے ساتھ اندر نہیں گیا۔

اس نے نیناں کو میرے آنے کی اطلاع دی پر وہ اس روز کی طرح جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا، اپنے دھول بھرے احاطے میں گرد اڑاتی ہوئی نہیں آئی۔ وہ برآمدے میں کھڑی رہی اور شاردا ہی مجھے لینے آئی۔

آج وہ ہمیں اپنے کمرے میں نہیں لے گئی۔ اس بڑے سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جو ڈرائنگ روم سے زیادہ ایک کورٹ روم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب گہرائی کی جگہ دہشت بھر گئی تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ٹھوس اور بے حس ہو گیا تھا اس کے ہونٹ ایک دوسرے پر سختی سے جم گئے تھے جیسے مدتوں سے ان پر مسکراہٹ نہ کھلی ہو۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں احساس ہوا جیسے میں نیناں سے نہیں مل رہا، ایک مجرم کو دیکھ رہا ہوں جو کچہری میں اپنے کسی ناکردہ جرم کی سزا کا فیصلہ سننے کٹہرے میں کھڑا ہو۔ جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑ چکی ہوں۔

"بہت دنوں میں آئے آپ بھائی صاحب؟" اس کی آواز میں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کوئی شکایت، نہ اپنانا، نہ پیار، خالی آواز تھی۔ بے جذبات، مدھم۔

"میں یہاں نہیں تھا نیناں۔ تمہاری شادی میں شریک نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔"

میری بات سن کر اس کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے کسی دیوانے کو کسی راہ چلتے ہوئے نے چھیڑ دیا ہو۔ اس نے کہا کچھ نہیں خاموش رہی۔ صرف ایک بار میری طرف دیکھا۔ اس نظر میں ان گنت شعلوں کی تپش تھی۔

"میں یہ للائی ہوں جناب کو۔ نہیں تو یہ آج بھی نہا تے۔" شاردا نے مسکراتے ہوئے کہا کہ فضا پر چھائی سنجیدگی چھٹ جائے۔ پر گھٹا بہت گھنی تھی چھٹی نہیں بلکہ اور نیچے جھک گئی۔

"بھائی صاحب میں نے اپنا کمرہ بند کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"اور اپنی تمام کتابوں کو پھاڑ کر جلا رہا ہے۔" اس نے میرے سوال کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ اور اپنی بات کہتی گئی۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" میں نے پوچھا مگر اس نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی۔

"اپنے ماحول سے انتقام لینے کا میرے پاس یہی ایک طریقہ تھا۔ میں دلیپ سنگھ نہیں تھی کہ یہاں سے بھاگ جاتی۔"

دلیپ سنگھ اس کے بھائی کا نام تھا۔ وہ دلیپ سنگھ کی بھاگنے کا اعتراف کر رہی تھی یا اس کی بزدلی پر طنز۔ میں سمجھ نہ پایا۔

اور اسی وقت تیئس چوبیس برس کا ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ نیناں اسی طرح بیٹھی رہی جیسے اسے اس کے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔

"نمستے بھابی جی!" شاردا اپنی جگہ سے اٹھی۔

"سیر ہے بھائی جان۔"

اس نے مسکرا کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر صوفے کی طرف لپکا جہاں نیناں بیٹھی تھی۔

ایک دم سب ہی شاردا اور میں اٹھتے ہیں   دھول اڑاتے گیٹ کی طرف
چل پڑے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے مُڑ کر پیچھے میں نے نیناں کی طرف دیکھا۔
وہ وہیں کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں نہ جانے کس شے پر گڑی تھیں۔

میں شاردا کو بازو سے پکڑ کر جلدی جلدی سڑک پر لے آیا۔ اس نے مجھ سے نہیں
پوچھا کہ میں نے مڑ کر پیچھے نیناں کو۔ حقیقت یہ ہے نہیں کہ، پر مجھے اس کی عادت کا پتہ
ہے وہ پوچھے گی ضرور۔

میں نے جانے کتنے ہی سگریٹ پھونک ڈالے ہیں۔ میرے ارد گرد گھنا
دھواں پھیلا ہوا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر شاردا نے مجھ سے یہ بات پوچھ لی
تو کیا جواب دوں گا؟

سکینڈل پوائنٹ

جب وہ صبح چار بجے بستر سے اُٹھ کر ہوٹل کے کمرے سے باہر آیا اور برآمدے میں کھڑا ہوا تو شہر ابھی سو رہا تھا۔ ہل اسٹیشن اسے یوں بھی ہمیشہ سوئے ہوئے سے شہر معلوم ہوتے تھے۔ جہاں کوئی ہنگامہ، کوئی تماشا، کوئی شور شرابہ نہیں ہوتا۔

اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور وادی میں دور تک نگاہ دوڑائی۔ کہیں کہیں اِکّا دُکّا روشنی جل رہی تھی۔ وہ پھر کمرے کے اندر آگیا، کپڑے بدلے، سگریٹ سلگایا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ کچھ دور چل کر جب وہ سکینڈل پوائنٹ سے گزرا تو اس نے لالہ لاجپت رائے کے بُت کو سلام کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ لالہ لاجپت رائے کی کمر پر پڑنے والی پچاس برس پہلے کی لاٹھیوں کی چوٹیں ابھی تک دُکھ رہی ہیں۔ اور وہ آج بھی عوام کے دُکھ درد میں شریک ہیں۔ وہ رِج کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے چوڑے کھلے میدان میں کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی شہر واقعی سو رہا تھا۔ وہ اسے سوتا ہوا چھوڑ کر جاکھو کی چڑھائی چڑھ کر ہنومان مندر کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ دوبارہ رِج پر واپس آیا تو کچھ لوگ گھروں اور ہوٹلوں سے باہر نکل آئے تھے۔ اُسے ہلکی سی تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ کچھ دیر سستا لے۔ وہ اس مخصوص بنچ کی طرف بڑھا جس پر وہ جب بھی شملہ آتا تھا پل دو پل کے لیے ضرور بیٹھتا تھا چونکہ وہ ہمیشہ صبح سویرے ہی نکل پڑا ہوتا تھا اس لیے یہ بنچ اسے خالی ہی ملا کرتی

تھی۔ صبح سویرے بھلا کون تھکا ہوا ہوتا ہے، اس وقت کسی کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے؟ اس بنچ، اس جگہ، اس منظر، سب ہی سے اس کی گہری وابستگی تھی۔ مگر آج جب اس نے بنچ کی طرف قدم بڑھائے تو وہ اچانک ٹھٹھک گیا۔ وہاں تو پہلے سے ہی کوئی بیٹھا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس بنچ سے اور اس جگہ سے اور اس منظر سے صرف اسی کی وابستگی نہیں کسی اور کی بھی ہے۔ اس احساس سے اس کے جذبۂ ملکیت کو ٹھیس سی پہنچی۔ اس نے کچھ اور آگے بڑھ کر دیکھا، وہ کوئی عورت تھی۔ اس کی پشت اس کی طرف تھی اور چہرہ سامنے پھیلی ہوئی وادی کی طرف، جہاں کہیں کہیں کسی گھر کی چھت دھوپ میں چمک رہی تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ دھوئیں کی ایک ڈوری اٹھتی ہوئی سی ہے جو فضا میں بکھر گئی ہے۔ وہ عورت، برت کی اس بنچ پر بیٹھی ہوئی اپنی نظریں نیچے پھیلی وادی پر جمائے سگریٹ پی رہی تھی اور کسی سوچ میں غرق تھی۔ اس کے قدم وہیں ٹھٹک گئے اور اس کی نظریں دھوئیں کی اس ڈوری سی لکیر پر جم گئیں جس کے چھوٹے چھوٹے حلقے خاموشی سے بکھر رہے تھے۔

یکایک ایک دوسرے کے کچھ لمحے آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔

شردھا اور وہ چنڈی گڑھ سے بس سے یہاں آئے تھے۔ ان کے ایم اے کے امتحان ایک دن پہلے ہی ختم ہوئے تھے۔ چھٹیوں میں اسے جالندھر جانا تھا، اس لیے وہ دونوں کچھ وقت ایک ساتھ گزارنے کے لیے یہاں آ گئے تھے۔ شام کی بس سے انھیں واپس چلا جانا تھا۔ کہیں رکنے کی مہلت ہی کہاں تھی، صرف ادھر ادھر گھومنے، تھوڑی دیر سستانے، کہیں کچھ کھا لینے اور ڈھیر ساری باتیں کرنے کے علاوہ وہ دونوں کر ہی کیا سکتے تھے۔ باتیں تو وہ بس میں بھی کرتے آئے تھے، لیکن ان کے پاس کہنے کو اتنا کچھ تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

مال پر امار یا کافی ہاؤس میں دو لوگ بیٹھے ہیں۔

"کتنا خوشگوار سماں ہے یہاں۔" سدھا نے کہا۔

"پہلا دورہ خوشگوار ہی ہوتا ہے۔"

"مگر میں تو کئی بار آچکی ہوں یہاں۔"

"میں خود بھی کئی بار آچکا ہوں یہاں۔ لیکن ہم دونوں ایک ساتھ پہلی بار آئے ہیں اس لیے یہ ہمارا پہلا ہی دورہ ہے۔" سدھا اس کا یہ جواب سن کر ہنس پڑتی ہے۔

بیرا ٹھنڈے پانی کے دو گلاس میز پر رکھ جاتا ہے۔

"دو ہاٹ کافی اور......"

"اور کچھ نہیں۔" سدھا ٹوک دیتی ہے۔

بیرا اپنی بے معنی مسکراہٹ بکھیرتا ہوا چلا جاتا ہے۔

وہ دونوں کافی پی کر باہر آجاتے ہیں اور مال کی طرف چلنے لگتے ہیں۔ اچانک بارش ہونے لگتی ہے۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگتے ہیں۔ سدھا کا بھاگ کر کسی دکان میں پناہ لینے کو جی چاہ رہا ہے۔

"چلو کسی دکان میں چلے جائیں۔"

"کیوں؟"

"بھیگ جائیں گے۔"

"ہمارے پاس بھیگنے کو ہے ہی کیا؟" امرت سدھا کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہتا ہے۔ سدھا خاموش ہو گئی ہے۔

سڑک پر تیز پانی بہنے لگا ہے۔ امرت اور سدھا بڑے سکون سے چلے جا رہے ہیں۔

"کیا واقعی کچھ نہیں ہمارے پاس بھیگنے کو؟" سدھا نے پوچھا۔

"صرف ایک شخصیت ہی تو ہے — اور وہ کبھی نہیں بھیگ سکتی - یہ کپڑے تو ابھی دھوپ نکلتے ہی سُوکھ جائیں گے" امرت نے کہا۔

اور وہ چلتے چلتے سکینڈل پوائنٹ تک پہنچ گئے ہیں بارش یکایک رُک گئی ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہے۔ لوگ پھر سڑک پر نظر آنے لگے ہیں۔

وہ دونوں لالہ لاجپت رائے کے بُت کے نیچے کھڑے ہیں "معلوم ہوتا ہے، میری زندگی میں بھی سکینڈل پوائنٹ آگیا ہے" سدھا کہتی ہے

"وہ تو سب ہی کی زندگی میں آتا ہے۔ تم اپنے گیلے بالوں سے پانی تو جھٹکو۔" امرت نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ہے۔

"وہ لمحہ آگیا ہے جب مجھے کوئی آخری فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔"

"آخری فیصلہ کرنے والوں کی سزا جانتی ہو کیا ہوتی ہے؟"

"نہیں۔"

"یا تو وہ کراس پر لٹکائے جاتے ہیں یا اُن کے بُت نصب کئے جاتے ہیں۔" امرت کہتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس نے پتلون کی گیلی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر گیلی ماچس سے سگریٹ سُلگانے کی کوشش کی ہے۔

"گیلی ماچس سے گیلی سگریٹ نہیں جلے گی۔"

"اس لئے ضروری ہے کہ جب احساس کی پھوار کے بعد تمہارا دماغ ہلکا ہو جائے تو اطمینان سے کوئی آخری فیصلہ کرنا اس سے گھومو پھرو اور محسوس کرو کہ زندگی کتنی حسین ہے اور یہ عام سے معمولی سے انسان کی ہلکی سی پھوار تھوڑی سی دھوپ اور لمحہ بھر کی سگریٹ پاکر کتنے خوش ہو جاتے ہیں۔"

پھر وہ دونوں چلتے چلتے رج کے عین درمیان کھڑے ہو جاتے ہیں اور امرت

پھر بولنے لگتا ہے۔

"اور یہ اکا دکا لوگ جو اپنی چھتریاں کھولے ہمارے پاس سے گزرتے جا رہے ہیں۔ زندگی کی بڑی اہم اکائیاں ہیں۔ انہی سے زندگی کے تانے بانے بُنے جاتے ہیں۔"

اور پھر وہ خاموش ہو جاتا ہے اور سدھا سے بے نیاز ان آٹھ دس بینچوں میں سے ایک کی طرف بڑھنے لگتا ہے جو سڑک سے ہٹ کر لوگوں کے بیٹھنے کے لئے رکھی ہیں۔ سدھا چپ چاپ اس کے پیچھے چلنے لگتی ہے۔ پھر امرت ایک بینچ کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور خاموشی اپنے سامنے ابھی ابھی دھوپ میں نہائی ہوئی خوبصورت وادی کو ایک ٹک دیکھنے لگتا ہے اور جانے کس سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" سدھا پوچھتی ہے۔

امرت اپنی بھیگی آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیتا ہے اور کہتا ہے "آؤ تھوڑی دیر ہم اس بینچ پر بیٹھ جائیں۔ اس لمحہ یہ بینچ ہماری ہے — ہم دونوں کی۔ اس وقت شملہ کی مال روڈ اور ریج اور یہ دھوپ اور یہ خوبصورتی سب ہماری ہیں۔ آؤ ہم انہیں اپنے اپنے دامن میں سمیٹ لیں جانے کب اور کہاں ان کی ضرورت پڑ جائے۔"

"تم تو کبھی کبھی ایسی باتیں کرنے لگتے ہو جو کوئی اس وقت کرتا ہے جب وہ تمام بندھن توڑ رہا ہو، مکت ہو رہا ہو......" سدھا اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔

"......ہو رہا ہو" امرت جملہ پورا کر دیتا ہے اور پھر زور سے قہقہہ لگاتا ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ واقعی مر رہا ہے۔

پھر وہ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہتے۔ پھر جانے کس جذبے کے تحت وہ دونوں اچانک ایک ساتھ بینچ سے لپٹتے ہیں اور

چلنے لگتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں .....

یہ پانچ برس پہلے کی بات ہے۔

پھر سدھا کی شادی ہو گئی اور امرت کور دہلی یونیورسٹی میں لیکچرار ہو گیا۔

آج پانچ برس کے بعد وہ پھر شملہ آیا تھا تا کہ دوبارہ کچھ دیر کے لیے اُن لمحوں میں جی سکے، جو نہ اب اس کے تھے اور نہ سدھا کے۔ ان پر دونوں کا اختیار ختم ہو گیا تھا۔

ان ہی لمحوں کی پھوار میں بھیگتے ہوئے وہ رِج پر کھڑا تھا۔ اور اس کے سامنے اسی بینچ پر جہاں وہ بیٹھنا چاہتا تھا کوئی عورت بیٹھی تھی اور بڑے انہماک سے سگریٹ پی رہی تھی۔

وہ وہیں کھڑا رہا اور اس کے آس پاس لمحوں کی ٹوٹی ہوئی کرچیں بکھری پڑی تھیں۔ اسے ایسا لگا کہ اگر اس نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو یہ تمام کرچیں اس کے پاؤں میں چبھ جائیں گی۔ وہ ایک بُت کی طرح بے حس اور بے جان کھڑا تھا۔ اتنے میں سامنے کی بینچ پر بیٹھی عورت اٹھی اور اس کے قریب سے گزر گئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ ایک نہایت تیز کرچ اس کی رُوح میں چُبھ گئی تھی۔ عورت چند قدم بڑھنے کے بعد اس کی طرف پلٹی۔

"میرا نام امرت ہے۔" اس نے کہا۔

"میرا نام بھی امرت ہے۔" عورت نے کہا۔

"تم سُدھا نہیں ہو کیا — سدھا بھاردواج؟"

"اب میں سدھا بھاردواج نہیں، امرت کور ہوں۔"

امرت یہ سن کر ہنس پڑا۔ نام بدلنے سے ماضی کی وابستگیاں بھی بدل جاتی

ہیں کیا؟"

"ہیں، لیکن انہیں زندہ رکھنے کے لیے خود کو ہر روز بدلنا پڑتا ہے،" سدھا بولی۔

"یہاں اس وقت کیا کر رہی تھیں؟"

"اپنی ٹوٹی ہوئی شخصیت کی کرچیں اکٹھی کر رہی تھی۔"

"لیکن وہ تو سب میرے پاؤں میں چبھی ہیں۔"

"تمہارے تو صرف پاؤں میں چبھی ہیں، میری تو روح لہولہان ہے ان سے۔ تم کہو، یہ ماتھے پر سیندور کیسا لگا رکھا ہے؟"

"جا کھیہ مندر میں ہنومان کے درشن کر کے آ رہا ہوں۔"

"برہم چاری ہو گئے ہو کیا؟"

"نہیں۔"

"تو لو سگریٹ پیو۔"

سدھا نے پرس میں سے گریٹ کا پیکٹ نکال کر اسے سگریٹ پیش کیا اور اس کا سگریٹ سلگانے کے بعد اپنا سگریٹ بھی جلا لیا۔

وہ باتیں کرتے کرتے ساتھ ساتھ چلتے جا رہے تھے۔ سکینڈل پوائنٹ پر رک کر سدھا نے کہا: "ہم لوگ کلارکس میں ٹھہرے ہیں۔ شام کو آؤ تو تمہیں اپنے ہسبینڈ سے ملواؤں۔ میرے بچے کو بھی دیکھنا۔ بڑا سویٹ ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے اس وقت بہت جلدی میں ہو۔"

"ہاں۔ چنٹو کے جاگنے سے پہلے پہنچنا ضروری ہے۔ نہیں تو میرے پتی دیو سارا ہوٹل سر پر اٹھا لیں گے۔"

"بڑا زبردست انتخاب ہوگا تمہارا؟"

نروان

ٹرین بمبئی سینٹرل سے چل پڑی ہے۔

آج سے دس دن پہلے یہ گاڑی اسی اسٹیشن پر رُکی تھی۔

آج میں اکیلا ہوں۔

اُس دن میں اکیلا نہیں تھا۔

اُس دن میں تمہارے ساتھ تھا۔

نہیں تم میرے ساتھ تھیں ——

اور میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اُن چیزوں پر ایک نظر ڈال رہا ہوں جو تم نے مجھے دس دن پہلے دکھائی تھیں۔ یہ بمبئی کا وہ حصہ ہے جہاں جون میں بمبئی شہر کی آبادی کا ایک خاص حصہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ ریلوے لائن کے قریب نشیب میں سڑتا ہوا گندہ پانی اور اس کے پاس رفع حاجت کے لیے بیٹھی ہوئی عورتیں، مرد اور بچے۔ منظر وہی ہے جو دس دن پہلے تھا۔

"زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں ہی تو ہم کو ایک دوسرے سے کتنا قریب لا دیتی ہیں۔"

یہ بات میں نے اس وقت کہی تھی جب تم نے مجھے سفر پر نکلتے ہوئے اپنے جسم کے بارے میں بتایا تھا۔

"جو بات میں تین سالوں تک ان چالوں جھگیوں اور کھولیوں میں گھومتے ہوئے نہ سوچ سکا تھا، تم نے ایک لمحہ میں کہہ ڈالی۔"

"تم نے زندگی پر صرف تھیسس ہی لکھا ہے، میں نے اس کا درد سہا ہے۔ زندگی کے پاس کتنا ناقابلِ برداشت درد ہے۔ تمہیں اس کا اندازہ نہیں۔"

تم نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے میرے ہاتھ کو دبایا تھا۔

اسی ہاتھ کی مضبوط گرفت کو اس لمحہ تلاش کر رہا ہوں، اپنے قریب اس سیٹ پر۔ اور یہ جھونپڑیاں تیزی سے گزرتی جا رہی ہیں۔ ہر جھونپڑی اپنے آپ میں ایک مکمل دنیا ہے۔ ایک چھوٹی سی مسئلوں سے اٹی دنیا، لیکن ایک حسین مستقبل کی جستجو میں بھٹکتی ہوئی زندگی۔ اور سیٹ پہ تمہاری کپکپاتی انگلیاں نہیں ہیں اور ڈبے میں چھنتی ہوئی تمہاری تیرتی نظریں نہیں ہیں اور تمہاری ساڑھی کا میرون پلو نہیں ہے اور تمہاری کلائیوں میں جھنکتی ہوئی کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں نہیں ہیں، جنھوں نے چوبیس گھنٹوں تک اس چھوٹے سے کمپارٹمنٹ کو سحر آلود رکھا تھا۔

وہ جوان سے دو جوڑے جو کسی پرائیویٹ فرم میں کام کرتے تھے اور اب دہلی سے چار دن کے لیے بمبئی گھومنے آئے تھے، تم سے بمبئی کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور تم انہیں اپنی تیس سال کی اس شہر میں گزری ہوئی زندگی کی روشنی میں شہر کے بارے میں تفصیلات بتا رہی تھیں، لگتا تھا جیسے تم ایک ہوشیار گائیڈ کی طرح انہیں تمام بمبئی میں گھما رہی تھیں۔ اور میں ایک [illegible] ان دونوں جوڑوں کو تمہارے ساتھ شہر کی تصور میں بسوں، ٹیکسیوں اور لوکل ٹرینوں میں گھومتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ جوڑے یوں لگ رہے تھے جیسے وہ کسی بہت بڑے اجنبی شہر میں بھٹک رہے ہوں اور نہ جانتے ہوں کہ آخر انہیں جانا کہاں ہے۔

"میں نے یا تم نے؟"

"دونوں نے ہی"۔ تم نے جواب دیا۔

"چاہو تو چھٹکارا پا سکتی ہو۔"

"اتنا آسان سمجھتے ہو اسے۔"

یہ باتیں ہم میرین ڈرائیو پر کھڑے کر رہے تھے۔ اور شام کے وقت لوگ اپنے آپ میں مست ایک دوسرے سے ایک دم بے نیاز اپنوں کی قربت کی خواہش میں بے قرار تھے۔ تبھی ایک ناریل بیچنے والا ادھر سے گزرا۔

"بہت میٹھا ہے میم صاحب۔"

"اسے کیسے معلوم ہو گیا بوڑھے کھوسٹ ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"یہ ہر روز یہیں کھڑے کھڑے نہ جانے کتنے ناریل پیڑ سے گرتے ہوئے دیکھتا ہے اور ان کے رس کی بوچھار سے شرابور ہو جاتا ہے۔"

"پیوگی ناریل کا پانی؟"

"پلا دو۔"

ناریل والے چھوکرے نے ایک ناریل میں سوراخ کر کے تمہیں تھما دیا۔ تم نے وہ مجھے دیا اور میں نے اس میں سے ایک گھونٹ پی کر تمہیں دے دیا۔

تم دونوں ہاتھوں سے ناریل کو تھامے ہوئے سارا پانی غٹ غٹ پی گئیں اور ناریل بیچنے والا چھوکرا حیرت سے تمہاری طرف دیکھتا رہا۔

"بہت میٹھا ہے نا میم صاحب؟" میں نے چھوکرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ چھوکرا جھینپ گیا۔

"بڑے بے شرم ہو تم!"

میں جواب میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن یہ موقع تو صرف سننے کا تھا، لیکن

نہیں۔

ناریل والا جھک کر اسی اندھیرے کے پاس کھڑا ناریل میں سوراخ کر رہا تھا۔

— دھندلکا گہرا ہو گیا تھا۔

ہم شہر کی گہما گہمی سے دور نکل آئے تھے۔ تم جو ہو کہ گیلی ریت پر ننگے پاؤں گھوم رہی تھیں۔ میں ساتھ چل رہا تھا۔

"جوں جوں رات بڑھتی جائے گی — لہروں کا زور زیادہ ہوتا جائے گا۔"

"اور ساحل کی یہ ریت بھی زیادہ ٹھنڈی ہوتی جائے گی۔"

"اور راہگیر بھی کم ہوتے جائیں گے۔"

"لیکن ریت کی اس خنکی میں ارمانوں کی بھیڑ لگ جائے گی، جو چاند کے الاؤ کے گرد جمع ہو جائے گی اور رات کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جائے گی۔"

"ہاں اور اس بھیڑ میں ہم کہیں کھو جائیں گے اور پھر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔" تم نے کہا۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ تم میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھو۔"

تم نے میرا ہاتھ کس کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میں تمہارے اور قریب سرک آیا — اور اپنی ٹھوڑی تمہارے کندھے پر ٹکا دی۔ تمہاری انگلیاں میرے نہایت ہی ٹھنڈی ہاتھوں میں ٹھٹھرتی تھیں۔

اور پھر جانے کتنی ہی دیر ہم یونہی ٹھہرے رہے۔ جب بھیگی ہوئی ریت سے پاؤں سکتے تھے بے حد سکون محسوس ہوا۔ ریت نے بستر وفا کی لہریں ابھری ہوئی تھیں۔ ندیاں ساحل کی طرف پہلے سے زیادہ آگے بڑھ آئی تھیں۔

تب نہ جانے کیا ہوا — تم نے ایک دم جھک کر اپنا ہاتھ میرے پاؤں پر رکھ دیا۔

"کیا کہہ رہی ہو یہ؟"

"کہیں میرا ہاتھ تو نہیں چھوڑو گے؟"

تم سسکنے لگی تھیں، تمہاری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"زندگی پہ تھیسس لکھنے والے بھی رو سکتے ہیں سبا!"

اور میں نے اپنے ہونٹ تمہاری آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں پر رکھ دیئے۔

"انسان کے آنسوؤں میں کتنا نمک ہوتا ہے!"

"اس نے تو دوسروں کے زخموں پر نمک چھڑکنا ہے۔"

یہ کہہ کر تم زور سے ہنس پڑیں اور اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال دیں۔ اسی لمحہ ادھر سے کوئی قلفی بیچنے والا اپنی لے میں آواز دیتا گزر گیا۔

"دِس از لائف!" میں نے کہا۔

اسی رات کو دیر سے کمرے پر دستک ہوئی — میں سویا نہیں تھا۔ زندگی بھر پڑا بے کار سی باتیں سوچے جا رہا تھا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو تم سامنے کھڑی تھیں۔

"کیوں، خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہ ہوتی تو یہاں کیسے آتی؟"

تم اندر آ گئیں، میں نے دروازہ بند کر دیا۔

"وہسکی ہے تمہارے پاس؟"

"کیا کرو گی وہسکی کو؟"

"جلدی سے ایک پیگ بنا دو۔ نیند نہیں آ رہی ہے۔"

کچھ دیر پہلے تو میں تمہارے ہی کمرے میں تھا، تم نے بیئر منگوائی تھی۔ دونوں گلاسوں میں ڈالتے ہوئے تم نے کراہی دی تھی اور پھر ایک گھونٹ لے کر اپنا گلاس الگ

رکھ دیا تھا۔ وہ بھی بعد میں مجھے ہی ختم کرنا پڑا تھا۔ کھانا بھی ہوٹل کی روم سروس سے کہہ کر تمہارے ہی کمرے میں منگوایا تھا۔ اور اب آدھی رات کے وقت نہ جانے تمہیں کیا سوجھی کہ ہوٹل کے دوسرے فلور سے چپکے سے خود ہی میرے کمرے میں آ پہنچی تھیں۔

"اس وقت تو تم نے برگر کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا؟"

"کڑوی لگی تھی۔"

"تو وہسکی میں کونسا شہد ملا ہوتا ہے۔"

"وہسکی میں شہد نہیں ملاتے — سوڈا ملاتے ہیں۔"

"جاؤ سو جاؤ۔"

"مجھے وہسکی پلاؤ، نہیں تو میں یہیں سو جاؤں گی۔"

میں نے ذرا سی وہسکی گلاس میں ڈالی اور اسے پانی سے بھر دیا۔

"ہمارے ساتھ دھوکا کرتا ہے مین — وہسکی کی جگہ پانی پلاتا ہے۔"

تم نے بہت ساری وہسکی گلاس میں انڈیل دی، جس سے پانی اور وہسکی دونوں ہی گلاس سے باہر اچھل پڑے اور پھر ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں دیکھتا رہ گیا۔

"نشہ ہونے سے پہلے اپنے کمرے میں پہنچ جاؤں گی۔"

تمہارے جانے کے بعد میں تمہاری اس کیفیت پر دیر تک سوچتا رہا۔

صبح تمہیں ٹیلیفون کیا۔

"کیسی ہے تمہاری طبیعت؟"

"جیسی شراب پینے کے بعد ہوتی ہے!"

میں نے تمہارا جواب سن کر ٹیلی فون بند کر دیا۔ شاید روایات کا پالا ہوا میرا دماغ اس جواب کے لیے تیار نہیں تھا۔

چند لمحوں کے بعد پھر گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا، تمہاری آواز تھی۔
"ناشتہ کرنے کے لیے یہیں آجاؤ ۔۔۔ گھنٹہ بھر میں۔"
میں نے جواب نہیں دیا۔ ریسیور رکھ دیا، طبیعت پر بھاری پن تھا۔

سانتا کروز ہوائی اڈے پر تمہیں چھوڑنے گیا تھا۔ اوپر جاتے ہوئے تم نے کہا تھا۔
"اسی ہوٹل میں ٹھہرے رہنا ۔۔۔ بدل مت دینا مہنگا سمجھ کر۔"
"اچھا۔"
"زیادہ شراب نہ پینا۔"
"اچھا۔"
"رات کو زیادہ دیر تک جاگتے مت رہنا۔"
"اچھا۔"
"وٹامن کی جو دو گولیاں تمہیں دی ہیں وہ روز ناشتے کے بعد ضرور کھا لینا۔"
"اچھا۔"
"واپسی کی ٹرین بمبئی سینٹرل سے روانہ ہوگی۔ وکٹوریہ ٹرمینس پر نہ پہنچ جانا کہیں۔"
"اچھا ۔۔۔ دیکھ میں تمہاری اتنی ساری باتوں کا ایک ہی مختصر جواب دے رہا ہوں تو تم کچھ انھیں۔"
"سب کچھ اچھا ہی ہے تو برا کیا ہے؟"
"انسان خود بُرا ہے، جو صدیوں سے بُرائی سے بچنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔
اور پھر بھی صرف بُرائی ہی کرتا ہے۔"
"یہ آرائے سنگ؟"
اور اسی لمحہ جہاز کے لیے لاسٹ کال ہوئی۔

"جاؤ ورنہ فلائٹ مس کر دو گی۔"

تم نے ایک بار میرے کھردرے بالوں کو اپنے ہاتھ کے پورے زور سے بکھرا دیا اور میرے ہاتھ میں پکڑے میرے نئے ناول کے مسودے کی فائل چھین لے گئیں۔

"اُسے میں پڑھوں گی، واپسی پر دہلی اسٹیشن پر لے لینا۔"

تم چیختی ہوئی سی اپنا جملہ پورا کرتے ہوئے ہوائی جہاز کی طرف بھاگیں۔

اور میں دور ٹرمینل میں کھڑا اس ہوائی جہاز کو اڑان بھرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جو ڈیڑھ گھنٹہ بعد پالم ہوائی اڈے پر اتر جائے گا اور میرے اور تمہارے درمیان سینکڑوں میلوں کا فاصلہ پھیلا دے گا۔

اور اب میں اکیلا ٹرین میں بیٹھا، ان دس دنوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ جو میں نے اس عجیب و غریب شہر میں گزارے ہیں اور ان لوگوں کا بھی خیال آ رہا ہے جن سے میں ان دس دنوں میں ملا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کا ہر انسان اپنی زندگی کا رس ایک گندے نالے میں بہا رہا ہے اور یہ گندہ نالا مختلف ناموں پر ایک گہرے اندھے سمندر میں مدغم ہو کر اسی کا ایک گندہ اور زہریلا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ لمحہ لمحہ زندگی کی رگوں سے اس کا تمام رس نچڑ جائے گا۔ اور وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ جائے گی اور اس ڈھانچے سے تاریخ کے وہ باب بنیں گے جن میں انسانی تہذیب اور روایات کے کھنڈر دفن ہیں۔

جانے کیوں میں سنکی بنتا جا رہا ہوں۔ تم میرے ناول کا جو مسودہ لے کر گئی ہو اُسے لوٹا دو گی۔ میں نے تمہاری ادھ پڑھی کتاب جو پڑھنے کو رکھ لی تھی وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ وہ کتابیں اور مسودے ہیں جو ہم الگ الگ پڑھ رہے ہیں لیکن اس کتاب کا کیا ہوگا، جسے ہم دونوں نے مل کر شروع کیا ہے۔ زندگی کی طویل اور مشکل کتاب!

ابھی تک جس کا بہت ہی ابتدائی حصہ ہم پڑھ پائے ہیں — اب اس کتاب کو دوبارہ

وقت کے لمحات میں محفوظ کر دیا ہوگا ماس گھڑی تک جب تم پھر وہاں سے اُسے اٹھا کر لے آؤ گی اور ہم دونوں چاند کی روشنی میں کسی سنسان کلیسا، قدیم کے ایک ویران سے کوتے میں بیٹھ کر پڑھیں گے۔

تم نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ سنگی بن مجھے گھیر سے جا رہا ہے۔ لگتا ہے جیسے مجھے وہ نگل جائے گا، جیسے میں ایک بہت گہرے سمندر میں غرق ہو جاؤں گا، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی لگتا ہے کہ تم اور میں وقت کے فاصلے کی گردش سے ایک دم باہر ہیں۔ یہ خارجی عناصر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم تو چاند اور تاروں کی بلندیوں پر بیٹھ کر وہ سب عظیم کتابیں ایک بار دوبارہ رچنے والے ہیں جن پر انسانی تہذیب کو ناز ہے۔

ہم ویدوں کی رچنا کریں گے۔

رامائن اور مہابھارت لکھیں گے۔

گوتم کے منتروں سے نروان کی کہانی تحریر کریں گے۔

کرائیسٹ کے خون سے انجیل مقدس کی تخلیق کریں گے۔

اور سحر کے وقت کسی مسجد سے اذان دیں گے اور بلند آواز میں کہیں گے کہ — خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ اور وہ سب کا پاسبان ہے اور سب کی تقدیر دیتا ہے۔

لیکن خدا سب کچھ ہے تو وہ انسان کی زندگی سے اس کا رس نچوڑ کر اسے گندے نالے کے پانیوں میں کیوں بہنے دیتا ہے؟

کیوں ہوتا ہے ایسا؟

گنگا اور جمنا کے پوتر جل میں گندگی کون پھینکتا ہے؟

آؤ — ہم دونوں مل کر اسے تلاش کریں جو یہ تمام اپمان کرتا ہے — اسی تلاش اور جستجو میں ہمارا نروان ہے۔

آنگن اور سیمائیں

وہ جلسے میں سب سے پیچھے والی قطار میں بیٹھی تھی۔ اُس کے آگے بے شمار
عورتیں تھیں جو اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے آئی تھیں اور اُن کا زیادہ وقت بچوں
کو سنبھالنے میں لگ رہا تھا۔ انہیں جلسے میں شامل ہونے کا موقع تھا لیکن
بچوں کو گھر چھوڑ آنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے وہ بچوں کو ساتھ ہی لے آئی تھیں لیکن
انہیں یہ فکر تھی کہ کہیں بچے رونے نہ لگیں اور سارے ماحول کو بگاڑ نہ دیں۔ لیکن
شانتی کو ایسی کوئی پریشانی نہیں تھی جسے وہ ساتھ اٹھائے پھرتی۔ یہ تو ٹھیک تھا کہ اس کے گھر میں ساس
کے مر جانے کے بعد سے کوئی بھی نہ تھا جو اس کی غیر حاضری میں گھر کی دیکھ بھال
کر سکتا۔ لیکن گھر کی یہ دیکھ بھال بھی کوئی اتنی بڑی سمسیا نہ تھی شانتی کے لیے۔ ایک
لڑکا تھا جو جوان تھا اور تین برس پہلے فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ جب بار بار وہ بھرتی
ہونے کے لیے بھرتی والے دفتر میں جانے کی ضد کرنے لگا تو اس نے روک دیا۔

"باپ نے ہی کون سی کمائی کر لی تھی جو اب بیٹا کرنے جا رہا ہے۔"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اور اسے اپنے سورگیہ پتی کی یاد آ گئی تھی جو
دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کی مدد کے لیے عراق گیا تھا اور پھر واپس نہ آیا تھا۔
شانتی کے گاؤں سے کئی اور جوان بھی گئے تھے جن میں سے شاید ایک آدھ ہی لوٹ کر آیا

بےشانہ لڑا تھا اور جس نے اس کے گھائل ہوتے ہوئے پتا کے منہ میں پانی ڈالا تھا اور پھر اس کے قریب کہیں کوئی بم پھٹا تھا اور اُس کی ایک ٹانگ کا نچلا حصہ کٹ کر جانے کہاں اڑ گیا تھا۔

شرتی نے بہت مخالفت کی بدھیے کو اس کی ذمہ داریوں کا خیال نہ آسکا۔ اُس کے سر پر تو جنت سوار تھا۔ اُس نے بہت دکھی ہو کر شکریہ کے ساتھ دونوں ماں بیٹی کو ہتا چھوڑ کر ربنک کے بھرتی دفتر میں چلا گیا تھا اور اُس دن جب وہ واپس گاؤں لوٹا تھا تو شرتی نے اُسے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے پردیس لڑ کر وہ واپس آیا ہو۔ اور پھر بلدیو چلا گیا اور جانے اُس کے پیچھے چہرے رہ گئے تھے شرتی کو ہنستے اور شرتی اپنے دکھ کو بھول گئی۔ ہاں کبھی کبھی راستے کے سناٹے میں جب فوج کی گاڑی ہوئی لوٹ کر آجانے کو یہ کچھ ہوئے۔ جب اس کے کانوں میں کچی سڑک پر دل سے ٹکراتی ہوئی بیساکھیوں کی آواز گونجتی تو اس کا دل ڈوب سا جاتا۔

اور پھر سال بھر کے بعد جب بلدیو دو مہینے کی چھٹی پر آیا تو اس کو ایسا لگا جیسے اس کا آنگن ڈھیر سارے پھولوں سے بھر گیا تھا۔ اُس میں پڑے گڑھے آہستہ آہستہ آپ پُر ہو گئے تھے اور اُس کے چراغ کی بتی کا جلنا چھوڑ دیا تھا اور ماں ایک ہی مقام پر رک کر بیٹے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"جانے سے پہلے گھر کا آنگن پکا کروا جاؤں گا۔"

"ابھی رہنے دو جب تمہارا بیاہ ہو جائے گا جب کروانا۔" ماں نے کہا۔

"بیاہ کے انتظار میں آنگن کا ناس مار دوں، تم عجیب باتیں کرتی ہو۔"

"اچھا بابا جیسے تمہاری مرضی۔"

اور کچھ ہی دنوں میں آنگن میں فرش لگ گیا۔ آنگن کے درمیان ایک بڑا سا گملہ بھی بنوا دیا تھا بلدیو نے تاکہ ماں اس میں تلسی کا پودا لگا کر اس کی پوجا کیا کرے۔ اور پھر

ایک صبح شرتی گاؤں کے باہر بنے مندر کے احاطے میں سے تلسی کا ایک پودا
بھی لے آئی تھی۔ بلدیوا اپنے کھیت سے صاف اور پوتر مٹی کے ڈھیلے لے آیا تھا
اور ماں بیٹے دونوں نے تلسی کا پودا لگا کر اُس میں پانی ڈالا تھا۔ شرتی نے اُس
گملے کے اوپر گنڈا لال دھاگے کے کئی چکر لگا کر باندھے تھے اور کہا تھا۔

"جس روز تمہارا بیاہ ہوگا تلسی میّا کے سامنے سونے کی کٹوری کی جوت
جلاؤں گی۔"

اور بلدیوا ہنس دیا تھا اور اس کی ہنسی کی روشنی میں کچے آنگن کا فرش ایک
نئی نویلی دلہن کی طرح شرما گیا تھا۔

اُس سے اگلے سال جب بلدیوا چھٹی لے کر گھر آیا تو وہ پہلے سے زیادہ
صحت مند اور تگڑا نظر آتا تھا۔ اُس کا چہرہ بھر گیا تھا۔ اور قد لمبا ہونے سے فوجی
وردی اُسے خوب سجتی تھی۔ گاؤں پکی سڑک سے تین میل ادھر رہ جاتا تھا۔ اس لئے
پیدل چلنا پڑتا تھا۔ شرتی کو بلدیوا کی آمد کا خط مل گیا تھا اس لئے وہ خود دوپہر کے
بعد بس کے اڈے پر پہنچ گئی تھی۔ اپنے بیس گز کے گھاگرے کو سنبھالتی ہوئی وہ
سڑک سے ہٹ کر پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ ہر بس کے آنے پر
اس کی نظریں بس سے اترتے ہوئے مسافروں پر جم جاتیں اور اُس کے قدم آپ
سے آپ سڑک کی طرف اٹھنے لگتے۔ اور جب اُسے بلدیوا کہیں دکھائی نہ دیتا تو
وہ اُداس ہو کر پھر چھاؤں میں بیٹھ جاتی۔ وہ پانچ چھ بسیں دیکھ چکی تھی۔ اور بلدیوا
نہیں آیا تھا۔ جانے دہلی میں کچھ دیر کے لیے رُک گیا ہو۔ کچھ خریدنے وریدنے
کے لیے ۔۔۔ اور پھر شام کے قریب بلدیوا آ گیا تھا اور شرتی لپک کر اُس کے پاس
پہنچ گئی تھی اور اُس نے اپنے مضبوط لمبے بازوؤں میں اپنی ماں کو دبوچ کر اُسے
شرما دیا تھا۔

ہی بھیج دوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد بس آگئی اور بلدیو اپنی ماں کو چھوڑ کر بس میں چڑھ گیا۔

بلدیو نے وعدے کے مطابق دو ماہ بعد روپے بھیج دیئے اور ماں کو اپنی کہی باتوں پر عمل کرنے کے لیے تاکید بھی کر دی۔

شرتی نے بڑے پیار سے زیور بنوائے۔ ایسے کہ اُس کی اپنی طبیعت خوش سا ہو گئی۔ کپڑوں کی جلدی نہیں تھی۔ وہ تو مہورت نکلتے ہی بن جائیں گے۔ زیادہ فکر گہنوں ہی کی تھی۔ اُس نے تلسی بتائی پوجا زیادہ سے زیادہ کرنی شروع کر دی — بس اب بہو آجائے تو وہی جوت جلایا کرے گی۔ اُس نے اس مقصد کے لیے سونے کی ایک چھوٹی سی دھوپ دانی بھی بنوائی تھی۔ شرتی اپنی کمزور آنکھوں سے آنے والے سمے کی تصویریں بکھیتی رہتی۔ اس میں اپنی کلپنا سے رنگ بھرتی۔ انھیں نکھارتی سنوارتی اپنی زندگی میں سجاتی رہتی۔

لیکن ایک شام اس کی تصویروں پر جیسے ایک دم کسی نے سیاہی پوت دی تھی۔ اُن سیماؤں پر جہاں بلدیو تعینات تھا چینی فوجیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ہر جگہ ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ سیدرکھی کے گاؤں کے بہت سے جوان وہیں تھے خود اُس کے اپنے گاؤں کے کئی جوان بلدیو والی پلٹن میں تھے۔ ہریانے کے جیالے جوان جنھوں نے ہر بار دشمن کے دانت کھٹے کیے تھے اب بھی اپنی روایت قائم رکھنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ چینیوں نے وشواس گھات کیا تھا۔ ایک دوست کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دینے والی بات کی تھی۔ لیکن اب تو سوال اپنے ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کا تھا۔ چھوٹی موٹی الجھنیں تو اب کوئی اہمیت ہی نہ رکھتی تھیں۔

ملک بھر میں جوش و خروش کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ہر جگہ چینیوں کے اس رویئے کی مذمت ہو رہی تھی۔ ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں دھن اور زیور جمع ہو رہا تھا۔ اس نے

کہ دیش کی سرحدوں پر لڑنے والے جوانوں کو ہتھیاروں کی ضرورت تھی جنہیں خریدنا ضروری تھا۔ ہریانہ کے لوگ بھی جاگ رہے تھے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کو کوشاں تھے۔ آس پاس کے سات گاؤں کے لوگ آج شرتی کے گاؤں میں اکٹھے ہوئے تھے۔ بہت بڑا جلسہ تھا۔ ایک بہت بڑی مہیلا لیڈر آئی تھیں۔ عورتوں کو بھی اُن کے فرض کا احساس دلانے کے لیے۔ شہر سے بھی نیتا لوگ آئے تھے۔ تقریریں ہو رہی تھیں۔ نعرے لگ رہے تھے۔ اور شرتی سب سے آخری قطار میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس گھڑی بلدیو بھی کسی مورچے پر ڈٹا دشمن کو آگے بڑھنے سے روک رہا ہوگا۔ وہ سوچ بھی رہی تھی، دیکھ بھی رہی تھی، سُن بھی رہی تھی۔ اُس نے دیکھا گاؤں کی عورتیں چھوٹے موٹے زیور دے رہی تھیں۔ انگوٹھی، بُندا، توڑی، بٹن، اور اُس طرح کے گہنے جنہیں عورتوں نے جانے کتنے سالوں سے اپنے ساتھ چپکائے رکھا تھا۔ سونا تو تھا لیکن اُس پر وقت کی گرد جم گئی تھی اور چمک پھیکی پڑ گئی تھی۔ اُس کا تو سونا بالکل نیا ہے اور چمکتا ہے۔

رکمنی کے زیور جیسا تو ایک بھی زیور نہیں تھا اُن سارے گہنوں میں لیکن وہ تو بلدیو کی امانت تھی اُس کے پاس۔ وہ آئے گا تو بیاہ میں رکمنی کو سب زیور دیے جائیں گے۔

لیکن پہلی سیماؤں پر لڑتے ہوئے جوان اپنے خون کے زیور بھی تو پہنا رہے تھے۔ آزادی کی اُس دیوی کو جس کی خاطر وہ جان پر کھیل رہے تھے۔

وہ سوچتی اور سنتی رہی۔ اور پھر چپ چاپ، پچھلی قطار سے اٹھ کر چلی گئی۔ کسی نے اُس کی طرف نہ دیکھا۔ سب اپنے اپنے دھیان میں مگن تھے۔ وہ تیز تیز بھاگی جا رہی تھی جیسے اُسے گاڑی پکڑنی ہو۔ دیر ہو گئی تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔ گھر پہنچ کر اُس نے ٹرنک کا تالا کھولا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ٹرنکوں کو کھولتے ہوئے تو غلط چابیاں لگا رہی تھی۔ اُسے گھبراہٹ سے پسینہ آ رہا تھا۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا اور تالا نہیں کھل

اس خانہ جنگی کو چار سال ہو گئے تھے۔ فوجیں ڈیرہ ڈالے پڑی تھیں۔ فوج کے رہنما ہر دم چوکس رہتے تھے۔ جانے کب مہندر ناتھ غافل ہو اور اُس پر دھاوا بول دیا جائے۔ لیکن یہ کمبخت غافل ہوتا ہی نہ تھا۔ رسنا مری تھی تو اُسے ایک بچی دے گئی تھی۔ وہی بچی جیاؤ اس کی زندگی بن گئی تھی۔ اُس نے بچی کا نام سمرتی رکھا تھا۔ جب وہ اُسے سمرتی کہہ کر پکارتا تو اُس کے پتلے پتلے گورے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ تو وہ اُس معصوم مسکراہٹ کی لہروں میں کھوتے ہوئے یادوں کے گہرے ساگروں میں اتر جاتا۔ اور رسنا کے ساتھ گزرے ہوئے دن سیپ میں پڑے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔ سیپیاں کھلتی جاتیں اور اَن گنت موتی بکھر جاتے۔ وہ ان موتیوں کو سمیٹنے لگتا۔ اور جب اُس کی جھولی بھر جاتی تو ایک زوردار لہر آتی اور اُس کے تمام موتی اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ اور اُسے اٹھا کر کنارے پر پٹک دیتی اور پھر وہ کنارے کی ریت سے اُٹھتا اور دیکھتا سمرتی اس کی بانہوں میں بھرپور نیند لے رہی ہے اور اس کے ہونٹوں کے گلاب اپنی خوشبو میں منہ چھپائے سو گئے ہیں۔

رسنا سے جب اُس کی شادی ہوئی تھی تو وہ اُس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ اُس نے اُس کی تصویر بھی نہ دیکھی تھی۔ ماں نے رسنا کی بات پکی کر لی تھی اور اُس نے انکار نہ کیا۔ لیکن جب شادی ہو گئی تو اُس نے جانا کہ ماں کا چناؤ غلط نہیں تھا۔ رسنا بہت اچھی لڑکی تھی۔ اُس نے آتے ہی یہ محسوس کر لیا کہ مہندر ناتھ کے جیون میں بے انتہا انتشار تھا۔ کہیں کوئی ترتیب یا سلیقہ نہ تھا۔ سب کچھ بکھرا ہوا۔ اور جب رسنا نے ایک آدھ چیز کو اٹھا کر سلیقے سے رکھنا چاہا تو مہندر ناتھ جھنجھلا اٹھا۔ جیسے وہ بے ترتیبی اور انتشار اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا تھا اور اس میں کوئی بھی تبدیلی گوارا نہ تھی۔ رسنا نے اس کی جھلاہٹ کو محسوس کر لیا۔ اُس نے جہاں چیزیں پڑی تھیں وہیں پڑی رہنے دیں۔ وہ صرف دیکھتی رہی اور اپنے ذہن میں اُن کی جگہ کا تعین کرتی رہی۔ اُس نے یہ جان لیا کہ

مہندر ناتھ کی زندگی کو اگر پڑھا جائے تو وہ صرف اس طرح سے کہ اُسے پتہ نہ لگنے کہ اُس کے
ارد گرد کچھ ہو رہا ہے۔ اُسے محسوس نہ ہونے دیا جائے کہ اس کی بکھری ہوئی قوتوں کو کوئی
اکٹھا کر رہا ہے۔ رشنا نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے اُسے اپنے روپ کی گھنی چھاؤں میں
تھپک کر سلا دیا۔ اور خود ماحول کو سنوارنے میں لگ گئی۔ وہ سویا رہا اور رشنا جاگتی رہی۔
وہ اپنے ایک ہاتھ سے مہندر ناتھ کے بالوں کو سہلاتی رہی، اور دوسرے ہاتھ سے اس کے
جیون کو نکھارتی رہی اور ایک صبح جب وہ ایک گہری اور پرسکون نیند سے جاگا تو اُس
کے من میں بے پناہ شانتی اور اُس کے ذہن میں بے حد طمانیت تھی۔ اور جب اُس نے
بھرپور نظر اپنے ماحول پر ڈالی تو رشنا کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ اُس کے کندھوں پر ہاتھ
رکھے کھڑی تھی اور اُس کے چہرے کی کیفیت کا اندازہ کر رہی تھی۔ رشنا کے ماتھے پر
پسینے کے قطرے اُبھرنے لگے اور جسم کانپنے لگا۔

"تمہارا جسم کیوں کانپ رہا ہے رشنا۔؟" اُس نے پوچھا۔

"ٹھنڈ لگ رہی ہے!" رشنا نے اپنے دل کی دھڑکن کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے جھوٹ بولا۔

"اور یہ پسینہ؟"

"یہ میری محنت کی شبنم ہے۔" رشنا نے اپنے پلو سے ماتھا پونچھتے ہوئے کہا۔
اور مہندر ناتھ نے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"یوں لگتا ہے جیسے جیون کا سارا انتشار ایک دم مٹ گیا ہے۔"

"کیسا لگ رہا ہے آپ کو؟"

"بڑا پیارا، بڑا سندر، بڑا خوبصورت۔" مہندر ناتھ نے یہ کہتے ہوئے رشنا
کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کیا، اور پھر اُس کے گالوں پر اپنی انگلیاں

پھیرنے لگا جیسے کوئی شخص آنکھیں بند کر کے کسی مجسمے کے خد و خال پر رکھ رہا ہو، اور رسنا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جان توڑ محنت کے بعد وہ ایک دم تازہ ہو گئی تھی۔

رفتہ رفتہ مہندر ناتھ اس نئے جیون کا عادی ہو گیا۔ ایک بندھی ہوئی رفتار، ایک ٹھہرا ہوا بہاؤ، گرہستی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں جن میں خلوص اور پیار تھا جس میں ماں کی ممتا تھی، بھائی کا احساس تھا، بڑی کی محبت تھی، اور رسنا کی لگن کی مٹھاس۔ سب کچھ بہت اچھا تھا۔ جیون جس سے مہندر ناتھ کبھی مطمئن نہ تھا ایک دم پرکشش بن گیا تھا، اور اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے جیون میں کہیں کوئی خامی نہ تھی۔ کہیں کوئی کمزور پہلو نہ تھا، کہیں کوئی ادھورا پن نہ تھا۔ جیون ایک دم مکمل، شگفتہ، شانتی اور رس بھرا تھا۔

اور پھر ایک شام رسنا ان سب سے روٹھ کر یوں چلی گئی جیسے اس گھر سے کبھی کوئی لگاؤ ہی نہ تھا۔ جیسے اس نے مہندر ناتھ کو کبھی پیار نہ کیا تھا۔ جیسے ماں، پورن اور جگرتی کو وہ کبھی جانتی ہی نہ تھی۔ دو سال کا طویل وقفہ سمٹ کر ایک نقطہ بن گیا۔ تنہائی کی ندی صحرا میں آکر یوں ایک دم سوکھ گئی تھی جیسے اس کا کبھی کہیں وجود ہی نہ تھا۔ برسات کی ایک شام کو جب جھاجوں پانی برس رہا تھا رسنا ان سب کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے سمرتی کو چھوڑ گئی۔

رسنا

برسات کی ایک شام

اور سمرتی!

مہندر ناتھ کی زندگی کا محور مسلسل بارشوں سے کمزور پڑ چکی چٹان کی طرح لڑھک گیا۔ ماں، پورن اور جگرتی نے تھوڑے ہی سمے میں گھر کی ٹوٹی ہوئی دیواریں دوبارہ بنا لیں، کواڑ مرمت کرا لیے اور صحن کے گڑھے بھر ڈالے۔ ڈیوڑھی کے ساتھ لگی ہوئی تلسی کی

میں نے دوبارہ پھول دینے شروع کر دیئے اور سب بھول گئے کہ کبھی سنا ان پھولوں کو اپنے بالوں میں لگایا کرتی تھی۔ ایک مہندر ناتھ تھا جسے یہ کبھی نہ بھولتا تھا۔ جب بھی چمبیلی کی بیل میں کوئی پھول کھلتا، اسے فوراً سنا کے لمبے لمبے کالے بال یاد آجاتے اور اس کا ہاتھ آپ سے آپ چمبیلی کی ڈالیوں تک پہنچ جاتا۔ اور پھر پھول کو لئے کچھ دیر تک وہ جانے کیا سوچتا رہتا۔ اور اسی لمحے سمرتی کسی کمرے سے نکل کر آنگن میں آجاتی اور مہندر ناتھ کے چہرے پر آسودگی ابھرنے لگتی۔ وہ سمرتی کو بازوؤں میں اٹھا کر چوم لیتا اور اسے چھاتی سے لگا لیتا۔ اور اس کے بالوں میں کنگھی کرتا، ان میں سرخ ربن باندھتا اور پھر چمبیلی کا سفید پھول اس کے بالوں میں لگا دیتا۔ اور پھر اسے بازوؤں میں اٹھائے سارے گھر میں گھومتا۔

"سمرتی اچھی لگتی ہے نا جاگرتی؟"

"ہاں پتا"

"اچھی لگتی ہے نا پورن؟"

"ہاں"

"ماں! اچھی لگتی ہے نا سمرتی؟"

"ہاں! پر تو شادی کیوں نہیں کر لیتا اب؟" ماں کہتی

"سمرتی کے بال اور خوبصورت ہو جائیں گے۔"

"چمبیلی کا پھول اور زیادہ مہک دے گا۔"

"تمہارا جیون سکھی ہو جائے گا۔"

اور جاگرتی، پورن اور ماں تینوں اس پر برس پڑتے۔ ایسے ہی لمحے میں وہ اپنے آپ کو کمزور پانے لگتا اور اس کے سامنے خوشی کی فوجیں پوری طاقت سے اس پر حملہ کرتی تھیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا تھا جس سے وہ ڈرتا تھا اور ایسا لمحہ کبھی نہ کبھی آہی جاتا تھا۔

اس لمحے وہ سوچنے لگتا۔ جاگرتی کا اگلے چھ مہینوں میں بیاہ ہو جائے گا، اور وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ پورن اپنا گھر بسا کر الگ ہو جائے گا۔ رہ جائیں گے وہ اور اس کی ماں اور سمرتی۔ ماں بوڑھی ہو گئی ہے اب بے چاری سے گھر نہیں سنبھالا جا سکتا۔ سمرتی کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ وہ کہاں تک کر سکتا ہے۔ ربّ۔ بالوں میں کنگھی کر دینے اور فراک بدل دینے سے تو تمام ذمہ داریاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ ایک معصوم بچے کو تو ماں کا بھرپور پیار اور وشواس چاہیے۔ ایک جوان عورت کی محبت جس میں حرارت اور زندگی ہے۔ اس کی ماں کے پاس محبت اور پیار کی کمی نہیں لیکن اس پیار میں اب تھکن آ گئی ہے، اس میں وہ حرارت نہیں، زندگی دینے والی وہ قوت نہیں اور پھر اس کے نظریے نصف صدی پیچھے کے نظریے ہیں، جو اگلی صدی میں پیدا ہونے والی نسل کے کام نہ آسکیں گے۔ سمرتی اگلی نسل کی نمائندہ ہے اور ماں گزری ہوئی صدی کی امانت دار۔ دونوں کا یہ بنیادی اختلاف نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن پھر بھی وہ ان سب باتوں کو نظر انداز کیے ہی جا رہا تھا۔ جب کہیں کسی رشتے کی بات چلتی وہ ایک دم بھنا اٹھتا اور گھنٹہ بھر کی چخ چخ اور گرما گرمی کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا، اور پھر ایک دن جاگرتی کا بیاہ ہو گیا اور وہ چلی گئی اور جاتے جاتے اس نے سمرتی کو بے حد پیار کیا، اب وہ اسے چھوڑ جو رہی تھی، اور پھر پورن تبدیل ہو کر کان پور چلا گیا اور جانے سے پہلے سمرتی کو دن بھر بازار کی سیر کراتا رہا اور اس کے لیے کھلونے خریدتا رہا جیسے اپنے کسی ضروری فرض کی آخری کڑیاں جوڑ رہا ہو۔

اور جب جاگرتی اور پورن چلے گئے تو گھر ایک دم سونا اور ویران ہو گیا۔ اسے پہلی بار اس شدت سے احساس ہوا کہ رسنا واقعی اسے سدا کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ اس کی بچی بے ماں کی تھی اور خود وہ ایک ساتھی کے پیار اور خلوص سے محروم ہو گیا تھا۔

پورن اور جاگرتی کے جانے سے وہ خوجیں بھی کمزور پڑگئیں جو اُس پر اکثر حملہ کردیا کرتی تھیں۔ اب ماں نے بھی اُن کی رہنمائی کرنا چھوڑدی تھی۔ اس نے اب یہ سمجھ لیا تھا کہ مہندر ناتھ اس کے کہے سے بیاہ نہ کرے گا۔ یوں روز روز کی جھک جھک سے کیا لابھ۔ مہندر ناتھ کالج میں پروفیسر تھا۔ صبح سویرے کالج چلا جاتا اور شام کو واپس آتا۔ کالج کھلے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کام زیادہ تھا۔ جانے کی پابندی تو تھی، لیکن واپس آنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ وہ شام کو گھر لوٹتا تو سمرتی اس کی راہ دیکھ رہی ہوتی۔ مہندر کو دیکھ کر اُس کے اداس چہرے پر ایک دم رونق آجاتی۔ مہندر ناتھ اُسے گود میں اٹھا کر خوب پیار کرتا اور پھر چائے پی چکنے کے بعد اُسے باہر گھمانے لے جاتا۔ اُس سے جو کچھ بن پڑتا وہ کرتا۔ لیکن پھر بھی اسے محسوس ہوتا کہ سمرتی کو کسی چیز کی ضرورت تھی۔ جو وہ اسے نہیں دے سکتا تھا۔ جاگرتی کے ہوتے وہ ایسی کھوئی کھوئی سی نہ رہتی تھی۔ اب جانے اُسے کیا ہو گیا تھا، تو کیا صرف جاگرتی کے جانے سے ایسا ہوا تھا۔ یا ایک جوان عورت کے پیار سے محروم ہو جانے کا نتیجہ تھا۔ کچھ تھا جسے وہ سمجھ نہ پا رہا تھا۔

آج کالج کا پہلا کانووکیشن تھا اور دیش کے ایک بہت بڑے نیتا سندیں تقسیم کرنے آرہے تھے۔ آج وہ دن بھر کالج میں مصروف رہا۔ شام کو تھوڑی دیر کے لیے گھر گیا۔ وہ بھی اس خیال سے کہ سمرتی کو دیکھ آئے۔ بے چاری اُداس رہے گی۔ گھر گیا تو سمرتی نے بھی اس کے ساتھ کالج چلنے کی ضد کی۔ موسم اچھا نہیں تھا اور بارش کے آثار تھے۔ وہ اُسے ساتھ لے جانا چاہتا تو نہ تھا، لیکن سمرتی نے جب رونا شروع کردیا تو اُسے لے جانا ہی پڑا۔

کالج کے کھلے میدان میں جلسے کا انتظام تھا۔ شامیانے لگے تھے۔ اسٹیج تیار تھی اور مہمانوں کے لئے کرسیاں لگی تھیں۔ اُس نے سمرتی کو پہلی قطار میں ایک کرسی پر بٹھلایا۔

گاڑی تھی اور آسمان سے خوب پانی برس رہا تھا۔ سمرتی نے ایک بار حیران نظروں سے شامیانے کی طرف دیکھا جہاں سے پانی گر رہا تھا اور پھر اس کی آنکھیں مسٹر کپور کے چہرے کی طرف اٹھیں جیسے پوچھ رہی ہوں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مسٹر کپور نے سمرتی کو اپنی دائیں بانہہ سے سرکا کر بائیں ران پر بٹھا لیا۔ اب شامیانے سے ٹپکتا ہوا پانی سمرتی پر نہیں مسٹر کپور پر گر رہا تھا۔ مہندر ناتھ نے دیکھا اس نے بائیں بانہہ سے سمرتی کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ بارش اسی تیزی سے برس رہی تھی۔

پنڈت منتر اُچار رہا تھا۔

بارش ہو رہی تھی۔

اور مسٹر کپور شاید جانتے کہ سمرتی کون ہے، اُسے بارش سے بچانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں خود بُری طرح بھیگ گئے تھے۔

سمرتی مسٹر کپور کے سینے سے لگ کر سو گئی تھی۔ اسے مسٹر کپور کے بھیگے ہوئے کپڑوں اور اس کی اجنبیت کا قطعی دھیان نہ تھا۔ وہ ماں سے محروم تھی۔ لیکن ممتا کی چاہ اُس کے معصوم سینے میں اُسی شدت سے تھی۔

مہندر ناتھ نے دیکھا۔ پھر اپنی بیوی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ شاید پوچھ رہے تھے کہ وہ لڑکی کون تھی جسے وہ اس طرح اپنی گود میں بٹھائے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا مسز کپور نے اپنے خاوند کی بات کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ مسز کپور نے گردن گھما کر آس پاس کی کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا۔ یہ جتانے کے لیے کہ اُس لڑکی کے والدین میں سے کوئی ہو تو اُسے لے لے۔ مسز کپور نے شاید اسے بُرا سمجھا اور اپنے خاوند کو غصیلی نظروں سے دیکھ کر سمرتی کو کھینچنے لگی۔

نئے گریجویٹ لڑکے اور لڑکیوں کو سندیں تقسیم ہو چکیں تو مہندر ناتھ کا دوست جس کے ذمے وہ اپنی بچی کو لگا آیا تھا دوڑ کر اُس کے پاس آیا۔ اب بارش بہت

ہلکی ہو چکی تھی، پر شامیانوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

"اب تو اپنی بچی کو سنبھالو، بے چاری مسز کپور کے کندھے بھی دکھنے لگے ہوں گے۔" مہندر ناتھ کے دوست نے کہا، اور جب وہ کرسیوں کی اس قطار کی طرف بڑھنے لگا تو پردھان نے اپنی تقریر شروع کردی، وہ پھر رک گیا۔

سمرتی مزے سے سو رہی تھی۔

تقریر ختم ہوئی تو وہ مسز کپور کے پاس گیا۔

"آپ کو بہت تکلیف ہوئی مسز کپور، شکریہ۔"

"تو یہ بچی آپ کی ہے؟" مسز کپور نے پوچھا۔ اور مسٹر کپور بھی مسکرا دیئے۔

"ہیلو، کیا حال ہیں مہندر جی؟"

"عنایت ہے۔"

"اچھا تو یہی بچی ہے وہ جس کی خاطر آپ شادی نہیں کر رہے ہیں۔" مسز کپور نے پوچھا۔

"آخر کیوں؟"

"میرا وشواس ہے کہ کوئی بھی عورت کسی غیر کے بچے سے پیار نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں۔ ہر نارمل عورت ہر بچے سے پیار کر سکتی ہے، پیار کرنا اس کی فطرت ہے،" مسز کپور نے کہا۔

"اب کر ڈالئے شادی مہندر صاحب،" مسٹر کپور مسکرا دیئے۔

مہندر ناتھ نے سمرتی کو مسز کپور کے بازوؤں سے لیا تو اس کی معصوم بھینچی ہوئی انگلیوں میں مسز کپور کی ساڑھی کے پلو کا کچھ حصہ پکڑا ہوا تھا۔ مہندر ناتھ نے چھڑانا چاہا تو مسز کپور نے روک دیا۔

"ایسے نہیں" ۔ مسز کپور نے آہستہ سے دھیرے دھیرے ان پتلی پتلی انگلیوں میں سے اپنے گیلے پلو کو کھسکایا اور پھر دھیرے سے مسکراتی ہوئی مسٹر کپور کے ساتھ پنڈال سے باہر نکل گئی۔

مہندر ناتھ وہیں الگ شامیانے کے ایک بانس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ لوگ پنڈال سے باہر نکل رہے تھے۔ بارش رُک گئی تھی۔ پردھان اسٹیج سے اتر کر اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ مہندر ناتھ ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور مسز کپور کی بات کے متعلق سوچ رہا تھا "ہر نارمل عورت ہر بچے کو پیار کر سکتی ہے" پر کیا ہر عورت نارمل ہو سکتی ہے؟ اور کیا وہ اپنے طبقے کے غیر صحت مند ماحول میں کبھی کسی نارمل عورت کو ڈھونڈ سکے گا؟ سمرتی اس کے کندھے سے لگی سو رہی تھی، اور وہ غیر ارادی طور پر اُس کی پیٹھ سہلائے جا رہا تھا۔

اُس کا چہرہ یوں بجھ گیا تھا جیسے جلتے ہوئے چراغ پر کسی نے پانی اُنڈیل دیا ہو۔

کتاب کور

دو سال کے دوران میں اُس نے یہ آٹھواں گھر تبدیل کیا تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا مکان کا مسئلہ حل نہ ہوا تھا۔ نہ ہونا تھا بھی مشکل۔ دراصل وہ ایک جگہ تین چار ماہ سے زیادہ ٹھہر بھی نہ سکتا تھا۔ اُس کی خانہ بدوشی کی حسرت اسی طرح پوری ہوتی تھی۔ وہ جب خانہ بدوشوں کے کسی ٹولے کو کہیں ڈیرہ ڈالے ہوئے دیکھتا تو اسے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوتا۔ کتنا پیارا ڈھنگ تھا زندگی گزارنے کا۔ بس بہے جاؤ، کہیں نہ رکو مت۔ رکو تو ذرا ستانے کو۔ پڑاؤ کو منزل بنا لینے کے جذبے سے نہیں۔ وہ جب کسی مکان میں تین ماہ رہ چکتا تو اُس میں بہت سے نقائص نظر آنے لگتے۔ کمرے تنگ معلوم ہوتے، کھڑکیاں بے ڈھنگی نظر آتیں۔ چھت ناہموار اور کمرے تنگ اور تاریک لگنے لگتے۔ وہی جگہ جو اُسے پہلے آرام دہ نظر آتے تھے ایسے ہی کمینے، ذلیل اور غیر مہذب سے لگنے لگتے۔ اور وہ تہیہ کر لیتا کہ اب اس مکان میں نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ بغیر کسی سے کچھ کہے مالک مکان کی ایک ایک پائی چکا کر چلتا بنتا۔ سامان ٹرک یا ٹانگے پر نہیں لے جاتا تھا بلکہ چھکڑے پر جیسے خانہ بدوش اپنا سامان لادتے ہیں۔ چارپائیاں اُلٹی پڑی ہیں، بالٹیاں ایک طرف لٹک رہی ہیں۔ کرسیاں اوندھی ہو کر ڈول رہی ہیں۔ بس کمی یہ رہ جاتی تھی کہ وہ خود کسی

خانہ بدوشوں کی طرح چھکڑے پر سوار نہ ہوتا تھا۔ اسے لوگ لاج سمجھ لیتے کچھ اور ورنہ اُسے تو اس بات سے بھی گریز نہ تھا۔ چھکڑا نئے مکان کے سامنے آ کر رکتا اور سامان اُترتا اور ایک دو دن وہ اس طرح رہتا جیسے واقعی خانہ بدوش ہو۔

یہ آٹھواں مکان بھی اُس نے اپنی اسی عادت کے مطابق حاصل کیا تھا۔ یہ مکان اُسے بہت پسند آیا۔ ایک اونچی کوٹھی تھی جس کا مالک ایک ریٹائرڈ فوجی کپتان تھا۔ اُس نے اپنے لیے تین کمرے الگ رکھ لیے تھے اور وہ انہیں میں رہتا تھا۔ یہ چھوٹی سی کوٹھی اُس نے کرائے پر دے رکھی تھی۔ راکیش کو یہ کوٹھی اس لیے مل گئی تھی کہ اُس کا ایک مجسٹریٹ دوست جو اس میں رہتا تھا تبدیل ہو گیا تھا اور جاتے وقت اس کی چابی اُسے دے گیا تھا۔ کپتان کو یہ بات ناگوار تو گزری تھی لیکن اُس نے مزاحمت نہیں کی۔ جس وقت راکیش نے مکان پر قبضہ کیا، کپتان اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ اُس کا گاؤں یہاں سے تقریباً بارہ میل دور تھا اور وہاں اُس کی زمینیں تھیں۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی جس نے سب سے پہلے راکیش کا سواگت کیا تھا، وہ کپتان کا السیشین کتا تھا جس نے اپنے قد اور خوفناک شکل سے اُسے بُری طرح ڈرا دیا تھا۔ اندر سے آواز سُن کر کپتان کی بیوی باہر آ گئی تھی۔

"سیزر، ادھر آؤ۔"

کتا دُم ہلاتا ہوا مالکن کی طرف چلا گیا اور راکیش نے اُن کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

"شکریہ کس بات کا؟" وہ اور قریب آ گئی اور سیزر اُس کے آگے پیچھے پھرتا ہوا بھونکنے لگا۔

"آپ نے میری جان بچائی ہے۔"

جواب میں وہ ہنسی۔ لیکن اس ہنسی میں ترنم نہیں تھا، شبکی تھی۔ وہ اتنی جاندار نہیں تھی جتنی اُسے ہونا چاہیئے تھا، اُسے حیرت تھی۔

راکیش اپنے ذہن میں اس جوان لڑکی کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اتنی کمسن اور جوان لیکن دبی ہوئی سی، جیسے اس کے ارتقا پر کوئی وزنی چٹان رکھ دی گئی ہو اور وہ اُس گھاس کی طرح ہو جو برسات میں کسی پتھر کے نیچے سے سر نکال رہی ہو، جس کی کونپلیں مُڑی تڑی ہوں اور رنگ ایک دم پیلا ہو گیا ہو۔

"آپ ——؟" راکیش اپنا سوال مکمل نہ کر سکا۔ اُس کے ذہن میں تذبذب اور اُلجھن تھی۔

"کہیئے ۔" وہ مسکرا دی۔

"میرا مطلب ہے؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اُس نے پوچھا۔

"آپ؟"

وہ ہنس دی جیسے کئی دن کی کھلی ہوئی کوئی کلی ہنسی ہو۔

"میں کپتان صاحب کی پتنی ہوں۔"

"مسز کپتان؟"

"جی میرا نام کتاب کورہ ہے۔" وہ مسکرائی اور اُس نے اپنے سر سے ڈھلکتا ہوا آنچل سنبھالا۔ اُس کی انگلیاں بہت خوبصورت تھیں۔

وہ اور قریب آ گئی تھی اور سیر اور زیادہ مچلنے لگا تھا۔

آدمی سامان اُتار رہے تھے۔ اب اُس کا وہ بکس اُتر رہا تھا جو اُس کا واحد سرمایہ تھا۔ بکس بہت بھاری تھا۔ اُتارنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ راکیش کو خدشہ تھا جیسے بکس زمین پر گر جائے گا اور اُس کی تمام دولت بکھر جائے گی۔ اُس کا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔

"اس میں اینٹیں بھری ہیں کیا؟"

"کتابیں ہیں مسز کپتان۔" راکیش نے بہت نرمی سے جواب دیا۔ اور اُس کی نظر پل بھر کے لیے اپنے سامنے کھڑی جوان عورت کی طرف اُٹھی۔ اُس کے گورے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ سہم گیا اور نظریں بچا کر کتابوں سے بھرے ہوئے بکس کی طرف دیکھنے لگا جو زمین پر رکھ دیا گیا تھا۔ جب اُس نے نظر اُٹھائی تو کتاب کو راپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی، چھوٹے قد کی پتلی سی عورت سا۔ راکیش کو ایسا لگا جیسے اس کے لیے حدوں سے باہر نکلنے کی مہلت ختم ہو گئی تھی۔ اور اب اُس کی حدیں اُسے دوبارہ واپس بلا رہی تھیں۔ راکیش کو محسوس ہوا جیسے ایک خوبصورت کتاب اچانک الماری سے باہر گر گئی تھی۔ ایسی کتاب جس کے صفحوں پر کسی کی انگلیوں کے نشان نہیں تھے۔ جو صرف خریدی گئی تھی، پڑھی نہیں گئی تھی اور اب وہ کتاب دوبارہ الماری میں رکھی جا رہی تھی اور اس پر تالا لگایا جا رہا تھا۔

راکیش نے اس رات کھانا نہیں کھایا۔ تھرموس میں کافی تھی، بسکٹ کا ڈبہ ساتھ تھا۔ اُس نے اُسی پر گزارا کر لیا۔ نوکر سامان سنبھالنے میں لگا رہا اور جب تھک گیا تو راکیش سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔ راکیش بکس میں سے کتاب نکال کر الماری میں سجا رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں کمرے کی فضا میں بکھیر رہا تھا۔

دروازے پہ دستک ہوئی۔

"جی۔"

"کس لیے؟"

"پڑھنے کے لیے۔"

"ینگ مین کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔ کتابیں پڑھنے والے زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ They are utter failures"

"یہی میری ہابی ہے۔"

"بکواس ہے۔ بیچ دو ان کتابوں کو۔ ورنہ انھیں الماری میں رکھ کر اوپر سے پردہ ڈال دو۔"

"کیوں؟"

اس سے پہلے کہ کپتان اس سوال کا جواب دیتا سیزر کے زور سے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔

تب راکیش سکتے کو جھٹک رہا تھا۔

"رات کو باہر مت رہا کرو۔ کتا پھاڑ دے گا۔" کپتان کی آواز گیٹ کے قریب گونج رہی تھی۔

راکیش کا نوکر جب اندر داخل ہوا تو بے چارہ بری طرح کانپ رہا تھا۔

"یہ خبیث کا غصہ ہے، ملک صاحب ذرا سنبھل کر رہنا۔" راکیش نے مسکراتے ہوئے اپنے نوکر کو طلب کیا۔ اور خود کتابیں ہٹانے میں لگ گیا۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب راکیش بستر پر لیٹا تو اس نے کپتان کے گھر سے بہت اونچے سروں میں بولنے کی آوازیں سنیں جیسے کپتان کسی کو دھتکار رہا ہو۔ اور اس کے ساتھ مسز ملک کی آواز بھی شامل تھی۔ کرخت اور زوردار۔

دوسرے دن راکیش آفس نہیں گیا۔ اُس نے دو دن کی چھٹی لے لی۔ بستر میں

لیٹتے ہوئے اُس نے سُنا۔

"مسٹر سودھی کیا کر رہے ہیں؟" کپتان نوکر سے پوچھ رہا تھا۔

"لیٹے ہیں۔ بیمار ہیں۔"

"ہماری طرف سے بول دینا۔"

"جی اچھا۔"

راکیش بیمار تو خیر کیا تھا، اُس کا ذہن ضرور پریشان تھا۔ یہ نیا گھر شاید اُسے راس نہ آئے۔ وہ گھر میں رہ کر کپتان کی حرکات اور اس کے سارے دن کے پروگرام کا اندازہ کرنا چاہتا تھا اور یہ تب ہی ممکن تھا جب وہ بیمار بن جائے اور کہیں باہر نہ جائے۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ کپتان صبح پانچ بجے اٹھ کر کتے کو ساتھ لیے سیر کو نکل جاتا ہے اور اپنے گھر کے مین دروازے میں تالا ڈال جاتا ہے۔ سات ساڑھے سات بجے کے قریب آکر تالا کھولتا اور گیٹ کے سامنے گزرتے ہوئے نالے کا پانی جو شہر کے واٹر ورکس میں جا کر سارے شہر کو سپلائی ہوتا تھا، ایک لوہے کی نالی کے ذریعے لان میں کھول دیتا اور پھر لان میں لگے ہوئے ایک ایک درخت اور پودے کو غور سے دیکھتا۔ اُس کے بعد غسل کرتا اور پھر ناشتہ کر کے آرام کرتا۔ چونکہ آبادی کا یہ حصہ شہر سے دو میل دور تھا، اس لیے دوسرے تیسرے روز سائیکل پر شہر جاتا، ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد جو سو جاتا۔ اور شام اپنی پرانی موٹر کار کو جو گیراج میں بند رہتی تھی، ادھر اُدھر سے دیکھتا اور بونٹ کو زور سے بند کرتا اور ٹیرر کو گالیاں دیتا ہوا چائے پینے کے لیے چھت پر چڑھ جاتا۔ وہ چائے چھت ہی پر پینا پسند کرتا تھا۔ رات کو ریڈیو سے انگریزی گانے سنتا اور پھر سونے سے پہلے تمام کمپاؤنڈ میں گھوم کر اور گیٹ کو تالا لگا کر ٹیرر کو ساتھ لیے اندر چلا جاتا جہاں کچھ دیر تک اُس کی زور زور سے بولنے کی آوازیں آتی رہتیں اور پھر بتیاں بجھ جاتیں۔

اور سناٹا چھا جاتا۔ کبھی کبھی بیئر کے بھونکنے کی آواز ابھرتی، یا کوئی پرندہ ڈر کر چیختا یا پھر الماری میں بند وہ خوبصورت کتاب جس کے مخروطی پروں پر آنکھوں کے نشان بنے ہوئے تھے ایک مقید پنچھی کی طرح اپنے پر پھڑپھڑاتی، شیشے سے سر پٹکتی اور تھک کر ہار جاتی۔ ایسے لمحوں میں راکیش اپنے سرہانے جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں چپ چاپ لیٹا اُن دونوں کے بارے میں سوچتا جو جنم جنم کی پیاس ہونٹوں پر لیے کائنات کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔

اُس نے دو دن میں کتاب کو ایک بار بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنی مخصوص حدود میں قید تھی۔ البتہ کپتان دوسرے دن شام کو اُس کا حال پوچھنے آیا اور سرہانے رکھی ہوئی کتاب کو دیکھ کر ڈانٹتے ہوئے بولا

"بیمار ہو، کیا پڑھتے ہو؟ پاگل ہو جاؤ گے۔"

"بغیر پڑھے میرے پاگل ہونے کے زیادہ امکانات ہیں کپتان صاحب۔"
راکیش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور کافی کا پیالہ پیش کیا جو اُس کا نوکر بنا کر لایا تھا۔

کپتان نے کافی کا پیالہ لے لیا۔

"تمہارے ساتھ عورت کوئی نہیں؟"

راکیش کپتان کے اس طرزِ تخاطب کا عادی ہو گیا تھا۔

"میری ماں اور بہن ہے۔"

"بس!"

"جی بس۔"

"بیوی نہیں ہے؟"

"شادی نہیں کی۔"

"بہت اچھا کیا۔ عورت سے چاہے جو بھی رشتہ رکھو آپ بیوی کبھی مت بناؤ۔"

"کیوں؟"

"سوال کم پوچھا کرو۔ زیادہ سوال پوچھنا گستاخی ہے۔"

راکیش مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"کب آ رہے ہیں تمہارے گھر والے؟"

"ہفتہ بھر میں آ جائیں گے، کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"سیر کرنے؟"

"جی نہیں ایک شادی اٹینڈ کرنے۔"

"بکواس۔"

راکیش خاموش ہو گیا۔ کپتان نے کافی ختم کر لی اور جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ" راکیش نے جواب دیا۔

کپتان گنگنانے کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اور جاتے وقت سرہانے رکھی ہوئی ادھ کھلی کتاب بند کر کے میز پر پٹک گیا۔ کتاب کو میز پر پٹکنے سے زور کی آواز پیدا ہوئی جس سے روشن دان کے پاس پردوں میں چونچ دیئے رات گزارنے والی چڑیا پھڑپھڑا اٹھی اور سیڑھی پر بیٹھ کر چہکنے لگا۔

راکیش تین چار روز دفتر میں زیادہ مصروف رہا۔ وہ دیر سے گھر لوٹتا اور پھر فائل ورک کرتا رہتا۔ آدھی رات تک اسے کسی دوسری طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ چونکہ صبح کو وہ دیر سے اٹھنے کا عادی تھا اس لئے بمشکل تیار ہو کر آفس پہنچ پاتا۔ چنانچہ کئی دن تک کپتان سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک شام جب وہ دفتر سے

"کم سے کم ایک صدی۔"

راکیش یہ جواب سن کر سکتے میں آگیا۔ اس مختصر سے جواب میں ایک نوجوان
عورت کی بے کسی، بے چارگی اور شکستگی کی پوری داستان تھی۔ ایک پوری کتاب
تھی اس ایک فقرے میں۔ اُس نے نظریں اٹھائیں۔ دو پتلے پتلے نازک ہونٹ تھرتھرا
رہے تھے۔ جیسے آندھی کا زبردست ریلا گلاب کے پھولوں کو روند کر چلا گیا ہو۔

"آپ کی ماتاجی اور بہن کب آرہی ہیں؟" اُس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال
لیا۔

"بس دو ایک دن میں آنے والی ہیں۔"

"تو شاید میری نظر بتاتی ہیں کچھ فرق پڑے۔ ہماری پہلی کرایہ دار مسز متل سے
تو کپتان صاحب کو چڑ تھی۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی لیکن نئے ڈھنگ سے رہنے
اور سوچنے والی۔"

"تو اس میں کیا برائی تھی؟"

"برائی یہ تھی کہ کپتان صاحب کو یہ انداز پسند نہیں تھا۔ جب تک وہ لوگ
یہاں رہے میں اُن سے صرف دو بار ملی۔"

"ایک بار آنے پر اور دوسری بار جانے پر۔ معلوم ہوتا ہے یہی سلوک
میرے ساتھ بھی ہوگا۔"

"یہ تو آپ کی ماتاجی کے آنے پر ہی سوچا جائے گا۔"

"سوائے آپ کے اور کپتان صاحب کے یہاں اور کوئی نہیں رہتا کیا؟"

"سیزر ہے اور پنجرے میں بند طوطا ہے۔"

کتاب کور نے جب یہ الفاظ کہے تو اُسی وقت گھنٹے کے بجنے کی آواز
آئی اور وہ بغیر کچھ کہے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ راکیش اُسے

جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کتنی متوازن چال تھی اُس کی اور کتنا غیر متوازن تھا اُس کا ماحول۔ اور پھر اُس نے دروازے پر رُک کر ایک بار راکیش کی طرف دیکھا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ راکیش نے برآمدے میں قدم رکھا اور سگریٹ سلگا لیا۔ نوکر اندر چائے لگا رہا تھا۔ وہ پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ کیپٹن چودھری نے گڈ نائٹ کہہ دی۔

دوسرے دن شام کو راکیش کی ماں اور اُس کی بہن مالتی آ گئیں۔ راکیش کے اس کوٹھی کے انتخاب پر دونوں خوش ہوئیں۔

"اس بار تم نے اچھا مکان لیا ہے" ماں نے کہا۔

"لیکن یہ رہے گا تب نا۔ کون جانے کب سنک سوار ہو جائے اور یہ بھاگ کھڑے ہوں" بہن نے جواب دیا اور لان میں اُگی ہوئی گھاس کی ہریالی اُس کی آنکھوں میں بھر آئی۔

"یہاں میرا بھی کچھ دن رہنے کو دل چاہتا ہے، مالتی۔"

"تمہاری روایات کے خلاف ہو گی یہ بات۔"

"یہ ترقی پسندی کا یُگ ہے، اس میں روایات بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔"

دونوں بہن بھائی بحث کرتے رہے اور ماں اندر چلی گئی۔ یہ بحث دو بیدار دماغوں کے ایک دوسرے کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش تھی۔

رات کو غیر متوقع طور پر کسی نے دستک دی۔ کپتان بعد میں آتا تھا اور اُس کا کتا پہلے آ پہنچتا تھا۔

"تو تمہارے گھر والے آ گئے؟"

"جی ہاں شام کو پہنچے ہیں۔"

اس کے بعد راکیش نے کپتان سے اپنی ماں اور ماتا جی کا تعارف کرایا۔ کپتان انھیں اس طرح جانچ رہا تھا جیسے انٹرویو لے رہا ہو۔ اور پھر وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔

"I like your people."

"تھینکس۔"

"مجھے تیل فیلڈ بالکل پسند نہ تھی۔ مسز تیل تو بس ڈیکوریشن پیس تھی۔"

کپتان کے اس ریمارک پر ماتا جی ہنس پڑیں۔

"عورت ڈیکوریشن پیس بھی تو ہے کپتان صاحب۔"

"نہیں، تمہارے خیالات سے مجھے بغاوت کی بو آتی ہے۔ فوجی بغاوت کو کچلتے ہیں۔ اُس کا ساتھ نہیں دیتے۔" کپتان بولا۔

"ٹھیک ہے کپتان صاحب۔" ماتا جی نے جواب دیا۔

ماں یہ سب باتیں سن رہی تھی اور خاموش بیٹھی تھی۔

"sabotage (سیبوٹیج) کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"unpardonable (اَن پارڈنیبل)" کپتان جیسے چیخ اٹھا تھا۔

لمحہ بھر کو سناٹا چھا گیا۔

ماں انگریزی نہیں جانتی تھی لیکن اُسے کپتان کا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔

کچھ دیر بعد کپتان چلا گیا۔

اب کور کو راکیش کے گھر آنے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

دھیرے دھیرے راکیش کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ پیام جواب تک برسات میں اُگی ہوئی گھاس پر پڑی اُسے کچل رہی تھی، کسی نے ایک جھٹکے سے ہٹا دی ہے۔ کونپلوں کا رنگ بدلنے لگا تھا اور اُن میں توانائی آنے لگی تھی۔ اب کور کی شخصیت نمایاں ہو رہی

تھی۔ سنور رہی تھی۔ نکھر رہی تھی۔ اُس کا لباس، اُس کی آواز، اُس کی ہنسی، سبھی کچھ بدل رہا
تھا۔ اُسے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ راکیش سے کوئی نہ کوئی کتاب لے جاتی لیکن پڑھتی
کپتان سے چھپ کر۔ کیونکہ کپتان کو کتابیں پڑھنا اچھا نہ لگتا تھا۔ راکیش کو محسوس ہوا
جیسے کانتا بذاتِ خود ایک کتاب تھی، الماری میں بند، حبس میں گھٹی ہوئی، جسے
الماری کا تالا کھول کر کسی نے پڑھنا تو درکنار کھول کر دیکھا تک نہ تھا اور اب
وہ کتاب باہر میز پر رکھ دی گئی تھی۔ اس کے اوراق کھلے پڑے تھے اور ہوا کے ہلکے
ہلکے جھونکوں سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ اور اُس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جب کوئی
انھیں چھوئے اور اُن میں اپنی انگلیوں کی زندگی بخش حرارت بھر دے۔

اب جب کبھی اُس کا راکیش سے سامنا ہوتا تو وہ پہلے کی طرح اپنا ڈھلکا ہوا
آنچل سنبھالنے کی کوشش نہ کرتی۔ راکیش نے دیکھا، اُس کے بال لمبے اور کالے تھے۔
اُس کی گردن پر ایک خوبصورت سا تل تھا اور گداز گلے کا ابھار اُسے اور بھی پرکشش بنا دیتا
تھا۔ اس کے ہونٹ پتلے اور ترشے ہوئے تھے۔ اُس کے دانت سفید اور ہموار تھے۔
اُس کی باتیں اچھی تھیں۔ وہ بڑی مہذب اور شستہ زبان بولتی تھی کیونکہ وہ اتر پردیش
کی رہنے والی تھی۔ اُس کے جنم سے پہلے ہی اُس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا اور اُس
کی ماں نے اُسے بڑے جتن سے پالا تھا۔ وہ اُسے کتابو کہہ کر پکارتی تھی کیونکہ اُسے
کتابوں سے بہت لگاؤ تھا۔ اور پھر کپتان چودھری نے اپنی آخری پوسٹنگ کے دوران
کتابو کو حاصل کرنے کے لیے کیا حربے استعمال کیے تھے۔ وہ اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ
چکا تھا۔ اُس کا اُس بیوی سے ایک لڑکا تھا جسے وہ خرچ دے کر گاؤں کے اسکول میں
پڑھاتا رہا تھا۔ اور جو اپنی ماں سے جھگڑتا رہتا تھا اور باپ کی طرفداری کرتا تھا۔
اور اسی میں کپتان کی جیت تھی۔ اور اب اُس کا لڑکا مہندر چودھری دو سال ہوئے
گھر سے چلا گیا تھا اور اُس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کپتان نے اُس کے بارے میں کچھ دکھ افسوس

کا اظہار نہ کیا تھا۔ پچھلے دو برس سے کتاب کور یہاں تھی اور ان چوبیس مہینوں میں
اُس نے ایک آدھ بار ہی گیٹ سے باہر قدم رکھا تھا۔ اخبار کے علاوہ اُس نے کوئی
اور چیز نہ پڑھی تھی۔ اُسے ریڈیو کا شوق تھا لیکن کپتان انگریزی گانے سنتا تھا۔
کیونکہ فلمی گانے اُسے پسند نہ تھے۔ کتاب کور کی زندگی میں کہیں کوئی رنگ، کوئی
اُتھل پتھل، کوئی چاہ، دمک، کچھ بھی نہ تھا۔ ایک سپاٹ اور سیدھا راستہ تھا جس
میں کہیں کوئی موڑ نہ تھا، اور اب راکیش کے آ جانے سے اُس کے جیون میں ایک
رنگ سا آ گیا تھا۔ وہ ایک موڑ پر کھڑی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ آگے کیا ہے۔ لیکن اُسے
اس بات کی خوشی تھی کہ اتنے لمبے سپاٹ راستے میں کوئی موڑ تو آیا۔ اس موڑ کے
آگے کیا ہے؟ شاید تصور نے اپنے دل میں اس کا کوئی تصور بھی کیا ہو۔ لیکن یہ تصور
واضح نہیں تھا۔ اور جیسے اُسے دیکھنے کو ملا اُس کی اُسے کبھی آشا نہ تھی۔ جس سے جیون
میں اُس کے بارے میں کبھی سوچا بھی تھا اُس نے اور چاہے کتنی ہی باتیں ......
سوچی ہوں، لیکن یہ جو کچھ ہوا، وہ کبھی اُس کے دھیان میں نہ آیا تھا۔ اس معاملے میں
وہ بالکل نردوش تھی۔

ایک شام جب راکیش لان میں بیٹھا مالتی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا
کہ کوئی چوبیس پچیس برس کا ایک نوجوان اٹیچی کیس اٹھائے گیٹ کے اندر داخل
ہوا اور پل بھر کو رکا۔

”کیپٹن چودھری کوٹھی کے کس حصے میں رہتے ہیں؟“

”سامنے والے حصے میں۔“ راکیش نے اشارے سے بتایا اور وہ نوجوان
سیدھا اُس حصے کی طرف چل دیا۔ کپتان باہر جانے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ اُسے
دیکھ کر رک گیا۔

"تم کہاں سے آ ٹپکے ہو؟ مجھے ایسے لوگ پسند نہیں۔"

سیزر اندر بندھا ہوا بھونک رہا تھا۔

نوجوان جانے کے لیے واپس مڑا۔

"رُک جاؤ۔" کپتان کی آواز گونجی۔

نوجوان رُک گیا اور پھر کپتان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ دوسری صبح معلوم ہوا کہ اُس نوجوان کا نام مہندر چودھری تھا اور وہ کپتان کا لڑکا تھا۔

"سوندھی، تم اسے کوئی نوکری دلا سکتے ہو؟ یہ میرا لڑکا ہے۔ یہ مجھے صرف اس لئے اچھا لگتا ہے کہ یہ اپنی ماں کے خلاف ہے، جسے میں چھوڑ چکا ہوں۔"

ایک دن کے بعد کپتان نے کہا۔

"میں کوشش کروں گا، کپتان صاحب۔"

"پلیز۔"

راکیش نے جان لیا کہ مہندر میں جوان جسم کے سوا اور کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتاب کور کے ساتھ اس نے بھی راکیش کے گھر آنا جانا شروع کیا صرف اس لئے کہ وہاں مالتی تھی۔ کچھ دن یہ سلسلہ چلتا رہا۔ راکیش نے [illegible] ایک دن سب لوگ پکچر دیکھنے گئے۔ اُس دن کتاب کور پیچھے، دو برس میں پہلی بار پکچر گئی تھی۔ ساتھ میں مہندر تھا، مالتی تھی اور وہ خود تھا۔

سیٹوں کی طرف بڑھتے ہوئے ہی ایک ٹھنڈ سی ہوئی۔ راکیش کو یہ بات اچھی لگی۔ مالتی سمجھدار لڑکی تھی۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی۔ پہلے کتاب کور پھر مہندر پھر راکیش اور سب سے آخر میں مالتی نے اپنی سیٹ لی۔ پکچر کے دوران میں راکیش نے دیکھا کہ مہندر کا سارا دھیان کتاب کور پر مرکوز تھا۔ کتاب کور نے کئی بار تھوڑا کھسکی بھی، وہ پکچر کا پورا پورا لطف لینا چاہتی تھی لیکن مہندر تھا کہ بس اپنی کیے جا رہا تھا۔ راکیش

بور ہوتا رہا، ماتی آرام سے پکچر دیکھتی رہی۔

چونکہ پکچر کی تجویز ماتی کی طرف سے تھی اس لیئے کپتان نے اعتراض نہ کیا تھا۔ لیکن اُن کے چلے جانے کے بعد وہ تاؤ کھاتا رہا۔ بلکہ سائیکل پہ سینما حال تک بھی پہنچا لیکن پکچر شروع ہو چکی تھی، سو وہ واپس آ گیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد وہ پھر وہاں آیا۔ اسی وقت انٹرول ہوا تھا۔ اُس نے دیکھا اُس کا لڑکا مہندر چودھری پہ نوازش کی دکان سے پان لے رہا تھا اور سگریٹ سلگا رہا تھا۔ کپتان نے سوچا سینما ہال میں جا کر کتاب کور کا ہاتھ پکڑ کر اُسے باہر کھینچ لائے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو روک دیا۔

پکچر ختم ہوئی تو راکیش نے گھر جانے کے لیے دو رکشا لیئے۔ ایک رکشے میں کتاب کور اور ماتی اور دوسری میں وہ اور مہندر بیٹھیں گے۔ اُس نے سوچا تھا۔ حالانکہ اُسے مہندر کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ تھا۔ کتاب کور جب رکشا میں بیٹھی تو مہندر ایکدم اُچک کر اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ماتی اور راکیش دوسرے رکشا میں سوار ہوئے۔

ماتی نے راستے میں ایک آدھ بار بات کرنے کی کوشش کی لیکن راکیش نہیں بولا۔ وہ صرف سگریٹ سلگاتا رہا۔ اور انھیں پیئے بغیر پھینکتا رہا۔

گھر پہنچے تو گیٹ پر کپتان کھڑا تھا۔ اُس نے مہندر اور کتاب کور کو ایک ہی رکشے سے اترتے دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

کتاب کور اپنا آنچل سنبھالتی ہوئی سہمی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔ اُس کے بعد ماتی، پھر راکیش اور سب کے بعد مہندر۔ کپتان کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف لوٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کپتان کے گرجنے اور کتاب کور کے رونے کی آواز آنے لگی۔ صرف مہندر کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کافی دیر یہ ہنگامہ ہوتا رہا اور پھر سب خاموش ہو گئے۔ صرف سیز رکھے نکلتا رہا۔

اگلے دن [illegible] راکیش کے گھر نہ آئی۔ اس سے اگلے دن بھی نہ آئی اور پھر
اُس سے اگلے دن بھی نہیں۔ بار بار ماتا جی خود گئی لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ واپس
آ گئی۔ کپتان کا روزمرہ کا پروگرام بھی بدل گیا تھا۔ وہ صبح کی سیر لان کی دیکھ بھال اور
چھت پر جا کر بیٹھنے کی عادت سب ختم ہو گئی تھی۔ وہ کئی دن سے نظر بھی نہ آیا تھا۔
ایک دن راکیش نے اُسے دیکھا تو وہ اُسے ایکدم بوڑھا نظر آیا۔ اُسے درد ہونے لگا۔
اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"کپتان صاحب طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟"

"حالت ٹھیک نہیں۔"

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"سیبوتاج (Sabotage)"

کپتان اور پھر ایک ٹھنڈی سانس ڈال کر گیراج کی طرف بڑھ گیا اور دیر تک اپنی پرانی
کار سے الجھتا رہا۔ پھر بونٹ کو زور سے بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ راکیش
اُس کے رویّے سے بہت متعجب سا ہی رہ گیا۔ وہ کپتان کی نقل و حرکت کا بہت غور سے
جائزہ لے رہا تھا۔ رات میں گھومتے ہوئے اُس نے دیکھا کپتان فوجی وردی پہنے
چھت پر بیٹھا پیالی کے بعد پیالی چائے پی رہا تھا۔ تپائی پر ایک بوتل بھی رکھی
تھی۔ شاید شراب تھی۔ اور پھر اندھیرا ہو گیا اور چھت کی بتی بھی دیر تک جل کر بجھ گئی۔

کپتان شاید اندھیرے میں بیٹھ کر شراب پی رہا تھا۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ راکیش کی ماں سو گئی تھی۔ ماتا جی کچھ پڑھ رہی تھی۔ راکیش
اپنے بستر میں لیٹا سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔

کپتان کے گھر میں جھگڑا شروع ہو گیا۔

راکیش اور ماتا جی کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔

کپتان گالیاں بک رہا تھا اور کتاب کور رو رہی تھی۔
مہندر سخت آوازیں کہہ رہا تھا۔
"تم ذلیل ہو۔ تم نے میری ماں کی زندگی برباد کی ہے۔ میں اس کا بدلہ لوں گا۔"
یہ مہندر کے الفاظ تھے۔ آگ اگلتے ہوئے الفاظ۔
اندھیرا آگ اگلتی ہوئی گولی کی چیخ گونجی۔ تیتی اندر تلملاتی ہوئی۔
سیزر گلا پھاڑ کر بھونکنے لگا اور درختوں پر بیٹھے پرندے رات کے اندھیرے میں چیخ چیخ کر اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔
اور پھر ایک ہائل سناٹا کراہنے لگا۔

اُس سے اگلی شام۔
کوٹھی کے گیٹ کے سامنے ایک چھکڑا سامان سے لدا کھڑا تھا اور راکیش گیٹ بند کرچکنے کے بعد اپنے نام کی تختی اتار رہا تھا۔ کتاب کور چھت پر کھڑی تھی اور جانے والے قافلے کو دیکھ رہی تھی۔ راکیش کو محسوس ہوا جیسے اُس کی کتابوں کا بکس کھل کر سڑک پر گر گیا ہو اور ایک نئی کتاب جو اُس نے بڑے چاؤ سے خریدی تھی اور جسے ابھی اُس نے کھول کر بھی نہ دیکھا تھا جس پر کسی کی انگلیوں کے نشان تک نہ تھے، اپنا تقدس کھو کے دلّے ہوئے آدمیوں کی چھینا جھپٹی سے ورق ورق ہو گئی تھی۔ اُس کی جلد اکھڑ گئی تھی۔ ٹانکے ٹوٹ گئے تھے اور اُس کا [illegible] بٹ رہا تھا۔ ورق ایک دوسرے سے الگ ہو کر ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ سڑک پر ان گنت انسان بکھرے پڑے تھے جنھیں لوگ اپنے پاؤں سے روندتے ہوئے بے پرواہی سے چلے جا رہے تھے۔ [illegible] طرف کھڑا حیرت زدہ سب دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور [illegible] کے ٹکڑے بگولے بن کر مضطرب اور بے قرار چڑیوں کی طرح ہواؤں میں چکر کاٹ رہے تھے۔

مجھے آواز دو

یہ مدھیہ پردیش کا آخری ریلوے اسٹیشن بیتول ہے۔ گھنے جنگلوں کے گھنے سایوں اور لمبی لمبی سرنگوں میں سے گزر کر گاڑی یہاں پہنچی ہے۔ زمین کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی ٹکڑیاں ہیں جن میں جوار کی پکی ہوئی فصل کھڑی ہے۔ جوار کے کچھ کچھ پودوں کو (ایک) گٹھے کی شکل میں باندھ رکھا ہے۔ ہوائیں ان پودوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بڑی سرمستی سے جھوم رہی ہیں جیسے کئی الھڑ دوشیزائیں ہوا کے پروں پر رقص کر رہی ہوں۔ مٹی کا رنگ سرخی مائل ہے۔ پنجاب اور ہریانہ کی مٹی سے ایک دم الگ۔ اس سرخ مٹی کی دھرتی پر کہیں کہیں سرخ، سبز اور نیلے شوخ رنگ کی لانگ والی دھوتیاں پہنے عورتیں بڑا ہی خوبصورت منظر پیش کرتی ہیں۔ ان کا رنگ ویسا ہی ہے جیسی یہاں کی مٹی ہے۔ لیکن چہرے پر محنت اور مشقت کی چمک ہے۔ صوبوں کی حد بندی کے باوجود بہت کچھ ان میں مشترک ہے۔ وہی کھیت، وہی فصلیں، وہی محنت کسانوں کی وہی سمسیائیں۔ ایک انسانی زندگی اپنے آپ میں جانے کتنی ہی زندگیاں سمیٹے ہوئے ہے۔

یہاں سے مہاراشٹر شروع ہو گیا ہے۔ اب ناگپور تک مہاراشٹر میں سے گزرنا ہوگا۔ ناگپور سے میری کچھ بڑی ہی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ ایسی یادیں جو ماضی کی

گزرگاہوں سے مجھے آوازیں آتی رہتی ہیں۔ وہ آوازیں اس لمحے بھی میرے کانوں میں رس گھول رہی ہیں۔ لیکن اس وقت مجھے چائے کی ایک پیالی کی بے حد ضرورت ہے۔ صبح سے چائے نہیں ملی۔ جی ترس رہا ہے چائے کے دو گھونٹوں کو۔ وہ آملا اسٹیشن آرہا ہے۔ مسافر کہہ رہے ہیں کہ یہاں ریفریشمنٹ روم ہے۔ چائے مل سکے گی۔ لیکن محسوس ہوتا ہے شاید میرے علاوہ کوئی بھی مسافر چائے کے لئے اس قدر پریشان نہیں۔ میرا ساتھی مسافر چکرورتی جو مشرقی بنگال کے ایک مہاجر خاندانوں کو پھر سے بسانے کے لیے بھی جا رہا ہے، بالکل خاموش اور کھویا ہوا سا ہے۔ یہ خاندان دو سال تک مغربی بنگال کے شرنارتھی کیمپ میں۔ وہ کہ اب اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنے والے ہیں۔ ان میں سے مچھیرے ہیں جن کا گزارہ مچھلیاں پکڑنے پر ہے۔ ان تمام خاندانوں کے مرد، عورتیں، بچے ایک نئی صبح کی تلاش میں ایک نئی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک ایسی منزل جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ نئی منزلیں اور نئی صبح کی یہ کھوج ہی دراصل انسانی ارتقار کا راز ہے۔ انسان جب نئی منزلوں اور نئی صبحوں کی تلاش چھوڑ دے گا، زندگی کی کہانی بھی ختم ہو جائے گی۔ چکرورتی اپنی بیوی کے بارے میں سوچ رہا ہے جسے وہ بیمار چھوڑ کر آیا ہے۔ وہ اپنے لڑکے کے بارے میں فکرمند ہے جس کے امتحان شروع ہونے والے ہیں اور اُسے ابھی تک بے فکر نہیں۔ چکرورتی جو اجڑے ہوئے خاندانوں کو بسانے کا کام کر رہا ہے خود اپنی زندگی کو نہیں بسا سکا۔ اُس کی اجڑی ہوئی زندگی کا پودا ابھی تک نئی دھرتی میں جڑ نہیں پکڑ سکا۔ وہ رات بھر آرام سے نہیں سویا۔ میں نے اپنی برتھ سے جب بھی اُس کی طرف دیکھا اُسے جاگتے ہوئے پایا۔

اور سامنے کی سیٹ پر ایک اور مسافر ہے۔ اس کا نام تیواڑی ہے۔ اور وہ متھرا کی ایک اسٹیل مل میں چیف کیمسٹ ہے۔ اُس کی بائیں ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا ہے۔

جس میں سے مواد رستا ہے۔ کئی برس سے ایسا چل رہا ہے اور اب یہ اُس کی ساری پنڈلی
پر پھیل گیا ہے۔ وہ اُس پر کوئی مرہم سا تھیپ دیتا ہے جس سے اُس کی پنڈلی پر موٹے موٹے
کھرنڈ بن گئے ہیں، لیکن مواد بند نہیں ہوا۔ مواد جب رستا ہے تو وہ اُسے رومال سے
اِدھر اُدھر سے صاف کر دیتا ہے اور پھر رومال جیب میں ڈال لیتا ہے اور کبھی کبھی
اُسی رومال سے اپنا چہرہ بھی پونچھ لیتا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس
کے چہرے پر بھی ایگزیما کی شروعات ہو چکی ہے۔ لیکن وہ اُس سے بالکل بے نیاز ہے۔
میں نے تیواڑی سے اس بیماری کے بارے میں پوچھا تو محسوس ہوا کہ وہ اسے زندگی
کا جزو مان کر اُس سے سمجھوتہ کر چکا ہے اور وہ کیمسٹری کا ایم ایس سی ہے۔ سائنس کا
اسٹوڈنٹ ہے لیکن اپنے جسم کی بیماریوں سے بے خبر ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ
اسی رومال سے اپنی یہ بیماری اپنے معصوم بچوں کے جسموں میں بھی منتقل کر ڈالے گا۔ اور
اُن کی صحت مند اور پاکیزہ دنیا کو ناسوروں اور زخموں سے بھر ڈالے گا۔
انبالہ کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں فوراً کھڑکی کی طرف لپکا۔ اور بیرے سے چائے
لانے کو کہا، جیسے میری برسوں کی خواہش زندہ ہو گئی ہو۔ چائے کا اس بے چینی سے شاید
زندگی میں پہلی بار انتظار کیا تھا۔ چائے کی پیالی ملی تو اپنے چھوٹے والے اٹیچی کیس
سے بسکٹ نکال کر منہ میں ڈالے تو محسوس ہوا جیسے مجھے جنت مل گئی۔ کئی دفعہ زندگی
کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں کتنی بڑی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ پھول کا رنگ، تارے
کی چمک، پائل کی جھنکار، گیت کا بول، چائے کا گھونٹ اور بسکٹ کا ایک ٹکڑا!
کئی دفعہ ایک چھوٹی سی خواہش کی تکمیل سے زندگی کس قدر حسین ہو جاتی ہے۔!
تیگاؤں ریلوے اسٹیشن آیا ہے اور پلیٹ فارم کے لگے تختے پر لکھا یہ نام
مجھے ایک بار پھر ماضی کی راہوں پر لے گیا ہے۔ ماضی کے چھوٹے چھوٹے سنگ میل
جن کا سہارا لیے سہمی سہمی یادیں رندھے ہوئے گلے سے کبھی کبھی آواز دے لیا کرتی ہیں۔

اسی نام کا ایک گاؤں ہریانہ ضلع کے گوڑ گوڑاؤں میں بھی ہے۔ یہ کیا عجیب اتفاق ہے کہ مہاراشٹرا اور ہریانہ میں ایک ہی نام کے دو گاؤں ہیں۔ جن میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن حقیقت میں اُن کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے۔ اور وہ رشتہ ہے انسانی محبت کا۔ اگر دو پنجابی، دو مدراسی اور دو بہاری آپس میں محبت کر سکتے ہیں تو ایک ہی نام کے دو گاؤں مختلف صوبوں میں ہوتے ہوئے بھی ایک وابستگی کی گرمی کیوں محسوس نہیں کر سکتے۔ گوڑ گوڑاؤں کا گاؤں ایک خشک اور قحط زدہ گاؤں ہے۔ اور مہاراشٹر کا یہ گاؤں سنگتروں کے رس سے لبالب بھرا ہوا۔ میں نے دیکھا جو سنگترے دہلی میں اتنے مہنگے ہیں وہ یہاں کوڑیوں کے مول بک رہے ہیں۔ تازہ تازہ سنگتروں کی خوشبو بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ میں نے جب ایک سنگترہ چھیلا اور اُس کی پھانک منہ میں ڈالی تو لگا جیسے بھینس کے تھنوں سے دودھ کی تازہ دھار اپنے منہ میں لے رہا ہوں۔ ایسی ہی دھار میرے چچا بھینس کا دودھ دوہتے ہوئے میرے منہ میں ڈالا کرتے تھے۔ برسوں پہلے جب میں گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا اور ماسٹر جی کی پٹائی سے ڈر کر اسکول سے بھاگ آیا کرتا تھا۔ سنگترے کی ایک پھانک میں نے چکرورتی کو پیش کی۔ اُس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔

"It is sour, I don't like it"

جو لوگ تازہ رس کی ہلکی سی ترشی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے وہ زندگی کی تلخیوں کا کیا خاک لطف لیں گے۔ میں اُس کا جواب سُن کر خاموش ہو گیا۔ کچھ بولا نہیں۔

تیواڑی کو سنگترے کی پھانک پیش کی تو اُس نے پھانک لیتے ہوئے میرے ہاتھ سے سنگترے کے چھلکے بھی اُٹھا لیے۔

"میں پھینک دیتا ہوں انہیں" میں نے کہا۔

"نہیں، مجھے دیجیے۔"

اور وہ پھانک کو منہ میں رکھ چکنے کے بعد اپنے چہرے کو سنگترے کے ان تازہ چھلکوں سے رگڑنے لگا ہے تو وہ اپنی بیماری سے ایک دم غافل نہیں۔ اُسے احساس ہے کہ وہ بھی بیمار ہے اور اُسے علاج کی بھی فکر ہے۔ اس کے باوجود وہ بیماری کا علاج کیوں نہیں کراتا۔ ایسی کوئی بنیادی اڑچن ہے۔ اور اُس کا کمزور اور لاغر جسم گواہ ہے کہ اُس کے پاس اتنی رقم نہیں جس سے وہ اپنا معقول علاج کرا سکے۔ اُس بن میں جہاں وہ کیمسٹ ہے، ہزاروں روپیوں کا تیل نکلتا ہے، لیکن اُس کی اپنی زندگی میں کہیں چکنا ہٹ نہیں۔ وہ ایک دم خشک اور بنجر ہے۔ چٹختی ہوئی چٹانوں کی طرح اُس کی پنڈلی پر جیسے کھنڈ کی طرح۔!

گاڑی ناگپور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کالی مٹی کے دور تک پھیلے ہوئے کھیت نظر آ رہے ہیں جن میں کپاس کے سفید سفید پھول چمک رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے یہ پودے جوان ہو کر جیتا کے تن ڈھانپنے کے قابل ہوں گے۔ اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالے یہ ننھے ننھے پودے اپنے خوبصورت پھولوں کی مسکراہٹیں لٹا کے جا رہے ہیں۔ بڑے سخی دل اور بے حد فراخدلی سے۔ ادھر بیچ بیچ میں سنگتروں کے جھنڈ نظر آ جاتے ہیں۔ اور اُن میں کام کرتی ہوئی عورتیں اپنی شوخ رنگ کی ساڑیوں میں محنت اور مشقت کی دیویاں لگتی ہیں۔ کبھی کبھی جوار کے کھیتوں میں حفاظت کے لیے بنے مچانوں پر کوئی لڑکی پرندوں کو اڑانے کے لیے شور مچاتی ہوئی نظر آ جاتی ہے۔ ویسے ہی کھیت جیسے میں بچپن سے دیکھتا آیا ہوں۔ وہی فصل، وہی ہل جوتنے کا ڈھنگ، فصلوں کی رکھوالی کا وہی طریقہ، کھیتوں میں پھوس کی چھت سے ڈھکے ہوئے ویسے ہی مچان جیسے اپنے گاؤں کی وہ ارغامین لڑکی بھی یاد آ گئی ہے۔ کوئی بائیس برس پہلے دیکھا تھا اُسے۔ اُس وقت اُس کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔ ہمارے کھیتوں کا کچھ حصہ اُس کے باپ نے بٹائی پر لیا ہوا تھا۔ وہ بھی فصل کے پک جانے پر اسی طرح مچان

پر چڑھ کر غلیل سے مٹی کے چھوٹے چھوٹے گولے رتی گگا لگا کر پھینکا کرتی تھی۔

"بیریا، مرجا تیوں"

طوطے ہی زیادہ نقصان کرتے تھے فصل کا، اور وہ اُس کی آواز سن کر اُڑ جاتے تھے۔ ٹائیں ٹائیں کرتے ہوئے اور پھر واپس آجاتے تھے۔ جیسے ہمی میں ادھر دھوں میں ہوڑ لگی رہتی تھی۔

اور جب کبھی کھیتوں میں اکا دکا جانا ہوتا تو وہ جھڑ بیریوں سے چھوٹے چھوٹے کھٹے میٹھے بیر توڑ کر مجھے کھلایا کرتی تھی۔ اور اُن کے ہاتھوں کی گوری گوری پشت پر بیر توڑتے ہوئے کانٹوں کی خراشیں پڑ جاتی تھیں، جن میں سے خون کی ننھی ننھی بوندیں اُبل پڑتی تھیں۔

آج نہ جانے کہاں سے یاد آگئی۔ اب تو زمانہ گزر گیا جھڑ بیریوں کے بیر کھائے ہوئے۔

او میدان پر بیٹھی ہوئی مہاراشٹرین لڑکی! کیا تمہارے ہاں بھی جھڑ بیریاں ہیں؟ کیا تم نے کبھی اپنے زمیندار کے لڑکے کو کھٹے میٹھے بیر کھلائے ہیں؟ کیا تمہارے ہاتھوں کی پشت پر بھی کانٹوں کی خراشیں ہیں؟

لیکن تمہیں دیکھ کر میرے دل کی خراشوں سے اتنے برس بعد خون کی بوندیں اُبل پڑی ہیں۔

او کپاس کے کھیتوں سے روئی کے پھول چننے والی لڑکیو! تم نے کبھی کوئی ایسا پھول بھی چنا ہے جس کی روئی سے تمہارے محبوب کا کرتہ بنا ہو۔ جس کی روئی کو چرخے پر کات کر تم نے محبت کے گیت گائے ہوں۔ تمہارے ہاں شاید ترنجن کا رواج نہیں ورنہ رات کو جاگ کر تم گیتوں کی تیسوں میں اُس بچھڑے کا انتظار کرتیں جو تمہیں روئی کے ان پھولوں کو اپنے شیشوں کی تصویر پہ چڑھانے کے لئے

محسوس ہوتی ہے -!

اور میں اپنے دائیں بائیں ٹرین کی کھڑکیوں کی دونوں طرف جھانک لیتا ہوں۔ جنگل اُگ آئے، کھیتوں کے بیچ میں کہیں کہیں کسی ندی کی سفیدی سی گوٹ، اور اُس کو چھوتے ہوئے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے -! خدا کرے یہ جنگل، یہ کھیت، ندی کی یہ گوٹ ابد تک قائم رہیں اور اُن سے کھیلنے والے محنت کے شہزادے اور مشقت کی یہ شہزادیاں ایک حسین زندگی کی دولت سے مالا مال ہو جائیں - اور ساحر کے ان مصرعوں کا مفہوم بدل جائے۔

یہ گھنے کھیت پیام شباب جو بچپن کا — ان گھنے کھیتوں میں بس بھوک اُگا کرتی ہے

اور ان گھنے کھیتوں میں بھوک کی جگہ خوشحالی اُگے اور میرے ملک کی ہر نسل ان خوشوں میں سے موتی اور جواہر چُنے -!

یہ کوئی عجیب سے نام والا اسٹیشن تھا جہاں گاڑی رکی تھی۔ لگتا تھا جیسے تیسری کی سرخ ڈھلوان چھت پر اپنی کمراہٹیں لٹاتے ہوئے رب کو خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔ پل کے نیچے ندی میں نہاتے ہوئے ننگے دھڑنگے بچے تالیاں بجا کر مسافروں کی طرف دیکھ رہے تھے اور گاڑی میں بیٹھے مسافر یا تو اونگھ رہے تھے یا اپنے میں کھوئے تھے۔ کسی نے اُن کی طرف دھیان نہیں دیا۔ چکرورتی براڈشا کے موٹے سے گرنتھ کو سارا ہی پڑھ ڈالنا چاہتا ہے اور اس میں بڑی طرح محو ہے۔ تیواڑی ابھی ابھی باتھ روم سے ہو کر آیا ہے اور اپنے آپ کو سنوار رہا ہے۔ وہ اُس رومال کو جس سے وہ اب تک اپنی پنڈلی سے رستے ہوئے مواد کو صاف کرتا رہا ہے، صابن سے دھولایا ہے اور اُسے ہوا میں سُکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کیوں سنور رہا ہے وہ کیوں ایک دم خوش نظر آنے لگا ہے -؟ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔ میں تو اُن معصوم بچوں کی مسکراہٹوں کا لطف لے رہا ہوں جو ندی میں بہتے ہوئے پانی کی طرح شفاف اور

نرمل میں گاڑی کا انجن کوئلے کے چھوٹے چھوٹے ذروں کو میرے بالوں میں جمع کرتا ہوا بھاگے جا رہا ہے۔ اگر میں نے کھڑکی بند نہ کی تو میرے بال کوئلے کی کان بن جائیں گے۔ میں نے کھڑکی کے شیشے چڑھا دیئے ہیں۔

تیواڑی گنگنانے لگا ہے۔

"روٹھ کے مت جانا......"

کسی فلمی گیت کا ٹکڑا ہے۔ بہت ہی معمولی قسم کا۔ لیکن وہ اُس سے بڑا آنند لے رہا ہے۔

پھر تاواڑا اسٹیشن آیا اور نکل بھی گیا۔ گاڑی تیزی سے گزر گئی۔ صرف ایک جھلک دیکھ پایا اُس لڑکی کی، جو اسٹیشن کے قریب کنوئیں سے پانی کھینچ رہی تھی۔ کنواں ایک دم سُنسان تھا اور وہ ایک دم اکیلی تھی۔ یہاں وہ پنگھٹ والی بات نہیں تھی۔ پنجاب اور ہریانہ کے کنوئیں تو دیہاتی زندگی کی جان ہوتے ہیں۔ وہیں تو کنواریاں اپنی زندگی کی روپ ریکھا بناتی ہیں۔ نئی بیاہتا لڑکیاں سرگوشیوں میں اپنے گبرؤوں کی محبت اور ساسوں کے قصے سناتی ہیں۔ ادھیڑ اور بوڑھیاں پیپل پر پانی چڑھاتی ہیں اور گاؤں کے جوان چھیڑ کر حُسن و شباب کی اس بہار پر حسرت بھری نظریں ڈالتے ہوئے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ اور اُن میں سے ایک کو وارث شاہ کی ہیر یاد آجاتی ہے۔

وارث شاہ میاں گتا چُپ سارا
مڑ او ٹکھلے تھریاں چھریاں دا

آواز کی گونج دھنک کے رنگوں کی طرح پھیل جاتی ہے اور کنواریوں کے رخسار تمتما جاتے ہیں اور اُن کی چوڑیوں کے چھنا کے فضا میں تحلیل ہو کر اُسے اور بھی دلکش بنا ڈالتے ہیں۔ لیکن یہاں لوگ وارث شاہ کو نہیں جانتے۔ انہیں جیمی پر گئے

بارے میں کچھ علم نہیں۔ انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ عورت کسی بھی صوبے اور کسی بھی ملک کی ہو، ہیر کی طرح ہی محبت کر سکتی ہے اور ریگ زاروں میں گھوم سکتی ہے اور بھینس چراتے ہوئے رانجھے کو چوری کھلا سکتی ہے۔!

اور وہ ناگپور کا اسٹیشن آگیا!

چکرورتی کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا ہو گیا ہے۔

یہاں وہ ڈبّہ جس میں مشرقی بنگال کے ایک مہاجر خاندان نئی منزل کی تلاش میں نکلے ہیں، کٹ جائے گا اور پھر آج شام کو دس بجے رائے پور جانے والی گاڑی سے اٹیچ کر دیا جائے گا۔ ان سب لوگوں کی منزل رائے پور ہے، مشرقی بنگال کے اکھڑے ہوئے لوگ مدھیہ پردیش کی دھرتی میں جڑیں پکڑیں گے۔ مہاجرین میں سے دو آدمی چکرورتی کا سامان لینے آگئے ہیں۔ پریشان حال انسان جو ایک نئی زندگی شروع کرنے والے ہیں، اُن کے ماتھوں پر فکرمندی کے آثار ہیں۔ اُن کے چہرے نڈھال اور سُتے ہوئے ہیں۔ میں چکرورتی کے ساتھ اُس ڈبّے تک آیا ہوں جس میں انسانی زندگی کا ایک جزیرہ قید ہے۔ چکرورتی سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں۔ میں تو صرف ان لوگوں کو دیکھنے آگیا ہوں۔ یہ مچھیرے، یہ عورتیں، یہ مرد، یہ بچے۔ یہ جزیرہ جیسے زندگی کے سمندر سے کٹا پڑا ہے۔ جانے کوئی کولمبس کبھی ادھر آئے گا کہ نہیں انھیں کھوجنے انھیں تلاش کرنے۔! محبت کا کولمبس، جو ہر جگہ نئی نئی دریافتیں کرتا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے دو روپیہ فی بالغ اور ڈیڑھ روپیہ فی بچّہ کے حساب سے اپنا سفر خرچ لے لیا ہے اور اپنے اعمال کا زادِ راہ لے کر ایک دشوار سفر پر چل پڑے ہیں۔

اے نئی منزلوں کے تلاش کرنے والے دلیر انسانو، خدا تمھیں نئی صبحوں کی روشنی سے مالا مال کر دے۔!

میں چکر ورتی سے ہاتھ ملا کر اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف لوٹ آیا ہوں۔!

تیواڑی پلیٹ فارم پر کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ جانے وہ ایک دم کیسا تنا بدل گیا ہے۔ پہچانا بھی تو نہیں جاتا۔ میں آنکھیں جھپک جھپک کر اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ بڑا مستحمند اور قابل قبول نظر آ رہا ہے۔ اُس کی ایکزیما سے نڈھال، کھرنڈوں سے بھری پنڈلی ایک بڑھیا پتلون کے اندر چھپ گئی ہے۔ کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ اُسے جلد کی اتنی پرانی اور نامراد بیماری ہے۔ اُس کے کوٹ کی جیب میں سُرخ ریشمی رومال کا کچھ حصہ بڑی بہار دے رہا ہے۔

"تم تو پہچانے بھی نہیں جاتے تیواڑی۔!"

جانے میں کیوں اتنا بے تکلف ہو گیا ہوں۔ بغیر سوچے سمجھے ہی بات کہہ دی ہے۔

"اِٹ اِز ٹرک آف دی ٹریڈ۔" وہ مسکرا دیا ہے۔

"میں کچھ نہیں سمجھ سکا تیواڑی"

"یو آر اے چائلڈ۔"

مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی ایک ناداں بچہ ہوں۔ اسی لئے مجھے کوئی ٹرک نہیں آتا، جس سے میرا ٹریڈ چمک اٹھے، لیکن میرا ٹریڈ ہے بھی کوئی؟

"اچھا بائی بائی۔" اُس نے ہاتھ بڑھایا ہے۔

"لیکن رُکو تو آخر اتنی جلدی کیا ہے۔؟"

"آئی ایم اِن اے ہری چائلڈ۔" وہ مسکرا دیا ہے۔

"بٹ وائی۔؟" میں نے پوچھا ہے۔

"آئی ہیو ٹو میٹ مائی گرل فرینڈ مائی بوائے۔ ہوپ ٹو میٹ اگین۔"

اور تیواڑی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے مس کرتا ہوا ایک دم گیٹ کی طرف بڑھ گیا ہے۔

اور میں ساکت و جامد، ٹرین کے سامنے پلیٹ فارم پر کھڑا لمحوں کی اُس طویل راہگذار کو دیکھ رہا ہوں جس پر جانے کتنے ہی سنگِ میل ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت سنگِ میل، جن کا سہارا لئے بھولی بسری یادوں کے چراغ مجھے آوازیں دے رہے ہیں۔

موہنجوداڑو کی ایک لڑکی

رات بارش ہو جانے سے موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ ورنہ دن بھر تو اس قدر لُو چلتی رہی تھی کہ اُس نے بن دالی جانے کا ارادہ قریب قریب ترک ہی کر دیا تھا۔ چاہے کسی جگہ پر تین چار ہزار سال پہلے کی تہذیب کے نشانات ملے ہوں اور اُس جگہ کی کئی بار کھدائی کے کام کا اخباروں میں خوب چرچا بھی ہوا ہو لیکن یہ تو کوئی ضروری نہیں کہ جلتے ہوئے انگاروں کی بارش میں ہی آپ اُن کھنڈرات کو دیکھنے جائیں۔ مگر رات کی تیز بارش اور صبح کے ٹھنڈے جھونکوں نے اُس کا ارادہ بدل دیا تھا۔ جب وہ تیار ہو کر ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں آئی تو لیلادھر بڑی مسکین صورت بنائے باہر کھڑا تھا۔

"گڈ مارننگ میڈم۔"

"گڈ مارننگ لیلادھر۔ کل شام جو میں نے بن دالی نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا اُسے میں نے ریوائز کر دیا ہے۔"

"تھینکس میڈم۔"

"لیکن دوپہر سے پہلے واپس آنا ضروری ہے۔"

"ضرور آجائیں گے میڈم۔ دوپہر کے بعد تو موسم بہت گرم ہو جائے گا۔"
لیلادھر نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔ وہ اتنا تیز بولنے کا عادی تھا کہ کئی بار
اُس کی بات بھی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اُس نے جیپ کے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ
کر دی۔ لیلادھر لپک کر جیپ کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور وہ ڈرائیور کے
ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ اُس نے
دھوپ کا چشمہ لگا لیا اور سیٹ کے ساتھ پیٹھ ٹیک کر خاموش بیٹھ گئی۔

رُوپا بہت کم گو قسم کی لڑکی تھی۔ یہ تبدیلی اُس میں پچھلے چار سالوں میں
آئی تھی جب سے اُس کا سلیکشن انڈین ایڈمنسٹریٹو سروسز میں ہوا تھا۔
سلیکشن میں آنے کے بعد بھی سال ڈیڑھ سال تک اُس میں زیادہ تبدیلی نہیں
آئی تھی۔ وہ بلند اور بیباک قہقہے لگاتی تھی، بڑی سلینگ قسم کی انگریزی بولتی
تھی اور بڑے دلگیر قسم کے جوکس کرتی تھی۔ پھر اچانک وہ بدلنے لگی۔ اُس کے
اونچے اونچے قہقہے ہلکی ہلکی مسکراہٹوں میں بدل گئے۔ اس کی گفتگو کا انداز تبدیل
ہو گیا اور اُس نے اپنے جوکس سنانے ڈرائنگ روم تک محدود کر دیئے۔ اب یہ جوکس وہ
صرف اپنے خاص دوستوں کو ہی سناتی تھی۔ اُس کے خاص دوستوں کا دائرہ بھی
آہستہ آہستہ سمٹتا گیا اور پھر وجے ہی اُس کا واحد دوست رہ گیا۔ اب وہ لطیفے
جوکس صرف اُسے ہی سناتی تھی [illegible] ہنستی تھی۔

نئی جگہ کی پوسٹنگ کے بعد جب وہ ڈپٹی کمشنر پوسٹ ہوئی تو دوسرے
محکموں کے علاوہ اُسے آثارِ قدیمہ کے محکمے کا بھی ایڈیشنل چارج ملا۔ آرکیا
لوجی سے اُس کا بہت پرانا انٹرسٹ تھا۔ وجے [illegible] کی ریسرچ [illegible] تھی جہاں
اُس کے پتا جی ٹھاکر مان سنگھ بڑے مشہور ایڈوکیٹ تھے۔ شاید اسی لئے اُس

کا نام بھی رُدیا ٹھاکر ہی تھا۔ یہ ٹھاکر لفظ اُسے پسند نہیں تھا۔ اس نام کے ساتھ جو کھردرا پن اور جاگیردارانہ نظام کی جو روایات وابستہ تھیں اُن سے اُسے نفرت تھی لیکن اسکول میں داخلہ لینے کے ساتھ ہی ٹھاکر کا لقب اُس کے نام کے ساتھ لگ گیا تھا اور وہ اُسے نبھائے جا رہی تھی۔ اس خیال سے بھی کہ جب اُس کی شادی ہو جائے گی تو اُس کے نام کے ساتھ جُڑا یہ فالتو لفظ خود بخود ہی الگ ہو جائے گا اور جب سے اُس کی دوستی چترویدی سے ہوئی تھی اُس کا یہ خیال اور بھی مضبوط ہو گیا تھا اور وہ کئی بار بڑی سنجیدگی سے سوچتی تھی کہ کسی روز اچانک وہ رویا ٹھاکر کی جگہ رویا چترویدی بن جائے گی۔

آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ کا چارج لیے اُسے ابھی کچھ ہی روز ہوئے تھے جب لیلادھر ایک فائل لے کر اُسے ڈسکس کرنے آیا تھا۔ لیلادھر اس ڈپارٹمنٹ کا ڈپٹی ڈائریکٹر تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بڑے ادب سے اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"گڈ مارننگ میڈم۔"

"گڈ مارننگ۔"

رُدیا ٹھاکر نے نظر اُٹھا کر جب لیلادھر کی طرف دیکھا تو وہ پل بھر کے لیے سکتے میں آ گئی۔ اُس کی شکل تو ایک دم چترویدی سے ملتی تھی۔ وہ لمحہ بھر اُس کی طرف غور سے دیکھتی رہی اور لیلادھر نے ادب سے نظریں جھکا لیں۔

"بیٹھیے مسٹر لیلادھر۔"

لیلادھر رُدیا کی میز کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے آخری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میڈم میں اپنے محکمے کا اس سال کا پروگرام ڈسکس کرنے کے لیے حاضر

ہوا تھا۔"

"مجھے آپ کے ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں قطعی کوئی واقفیت نہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ اب تک آپ کیا کر چکے ہیں۔"

رُوپا کی بات سُن کر لیلادھر نے آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ کے بارے میں بہت تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ وہ بڑا امپریشنل ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنی باس کو ایک ہی ملاقات میں برسوں کی باتیں بتا دے۔ رُوپا لیلادھر کی باتوں کو اتنا نہیں سُن رہی تھی جتنا کہ اُسے آبزرو کر رہی تھی۔ اُس کی شکل ایک دم جیتر دیدی سے ملتی تھی۔ اُس کی آواز کا بھاری پن بھی اُسی کا سا تھا لیکن وہ اتنا تیز بولتا تھا کہ سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ اور پھر شاید اُسے اتنی چھوٹی عمر میں دمہ کا بھی مرض ہو گیا تھا کیونکہ جب وہ تھوڑی دیر تیز تیز بول چکا تو اس کی سانس پھولنے لگی اور اُس کے حلق سے دھونکنی کی سی آواز آنے لگی۔

"آر یو سِک مسٹر لیلادھر؟"

"نو میڈم!"

"آپ کی تو سانس پھول رہی ہے۔ یو بیٹر گو اینڈ ٹیک ریسٹ۔"

روپا کی بات سُن کر لیلادھر کے ماتھے پر پسینے کے قطرے پھوٹ پڑے۔ وہ گھبرا گیا۔ اُسے اس طرح پریشان ہوتے دیکھ کر رُوپا کو بڑا لطف آیا۔

"میں رات سو نہیں سکا میڈم!"

"پکچر کا آخری شو دیکھنے گئے تھے۔؟"

"نہیں میڈم۔ میری وائف بیمار تھی۔"

اگر لیلادھر کا جواب یہ ہوتا کہ ہاں وہ آخری شو دیکھنے گیا تھا اور پکچر ختم ہونے کے بعد اُسے رکشا یا اسکوٹر نہیں ملا تھا اور اُسے پیدل گھر جانا پڑا تھا تو روپا

خوش ہوتی کیونکہ چترویدی ایسا ہی کرتا تھا اور جب کبھی وہ دونوں ملتے تھے تو دونوں ہی ایسا کرتے تھے۔ لیکن لیلادھر نے اپنی بیوی کا ذکر چھیڑ کر اپنے باس کی ہمدردی حاصل کرنی چاہی تھی اور وہ بابو کھلا اٹھی تھی۔

"ڈاؤنٹ فیئر یور ہوم سیکریٹس وِدھ می۔"

لیلادھر کے تو ہوش گم ہو گئے۔

"آئی ایم سوری میڈم۔"

"یو کین گو۔ مجھے ضرورت ہوگی تو میں خود آپ کو بلوا لوں گی۔"

لیلادھر جب کرسی سے اٹھا تو اس کے ہاتھ کی فائل نیچے گر گئی۔ جب وہ فائل اٹھانے کے لیے جھکا تو اس کی جیب میں سے قلم بھی نیچے گر پڑا۔ جب وہ شکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا تو رو پلسن نے بہت زور کا قہقہہ لگایا۔ ایسا قہقہہ اس نے بہت دنوں سے نہیں لگایا تھا۔ "سالا ایک دم ایڈیمیٹ ہے۔" اس نے اونچی آواز میں کہا اور سائڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر گئی۔

یہی جملہ اس نے اس دن استعمال کیا تھا جب چترویدی نے مسوری کی نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن میں ٹریننگ کورس کے دوران اس سے اظہار محبت کیا تھا۔ لیکن چترویدی کی زبان بہت شستہ تھی اور اس کا لہجہ بہت صاف تھا۔ اور وہ جب بات کرتا تھا تو لگتا تھا جیسے واقعی کوئی ذہین شخص گفتگو کر رہا ہو۔ یہ سب باتیں روپا ٹھاکر جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھی سوچ رہی تھی اور دھوپ کے چشمے کے پیچھے اس کی آنکھوں میں کونسا جذبہ تحلیل ہو رہا تھا اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اچانک اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

"مسٹر لیلادھر۔؟"

"یس میڈم ۔"

لیلادھر بے چارہ اب تک کانٹوں کی نوکوں پر بیٹھا تھا۔ رُوپا کی آواز سُن کر چونکا۔ لیکن روپا نے اُس سے اور کچھ بھی نہیں کہا۔ اُس نے صرف تنگ کرنے کی غرض سے لیلادھر کو پکارا تھا۔ جانے کیوں اُسے لیلادھر کو اس طرح تنگ کرنے میں لُطف آتا تھا۔

رُوپا کو یاد آرہا تھا جب وہ ایک بار جے پور کے آمیر پیلس کو دیکھنے گئی اور اُس کے ساتھ اُس کے کالج کی کچھ اور دوست لڑکیاں بھی تھیں تو اُس نے پہاڑی کی آخری چوٹی پر کھڑے ہو کر کہا تھا۔

" خودکشی کے لیے اس سے حسین جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی ۔"

" یہ پُرانی بات ہے۔ اب تو رواج قطب مینار کا ہے ۔" اس کی ایک دوست نے جواب دیا تھا۔

" میں نے ابھی تک دیکھا نہیں ہے ۔ ایک بار دیکھ لوں تو کمینٹ کروں گی ۔"

اور ایک بار جب وہ بھارت درشن کے دوران اپنے گروپ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ دہلی گئی تھی اور مہرولی میں قطب مینار کو دیکھا تھا تو اُسے معلوم ہوا تھا کہ اب سرکار نے مینار کی آخری دو منزلوں پر جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اُس نے ہنس کر کہا تھا۔

" اسے وری ڈلگر بیق ۔"

" بیئر آر یہ سٹلی ولگر ۔ " یہ چترویدی کا کومینٹ تھا۔

" وی ڈونٹ ری پیٹ آسکر وائلڈ دَتھ آؤٹ ڈسکریشن ۔"

" اٹ از ناٹ آسکر وائلڈ رُوپا "

"مسٹ بی سم ادر ایڈ ہیٹا ہے"

"لائک ہم۔" ایک دوسرے پیچ میٹ نے چترویدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"لائک موسٹ آف اس۔" چترویدی نے جملہ چست کیا تھا اور اُس کے اس جواب پر سب لوگ ہنس پڑے تھے اور ان ملے جلے معصوم اور بیباک قہقہوں کی گونج دیر تک قطب مینار کے گھیروں میں گونجتی رہی تھی۔

جیپ کا ڈرائیور بڑی محویت سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد صرف اپنی ماضی کی بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کی خاطر دیا تھا کر اُس نے ایک بار پھر پیچھے گھوم کر دیکھا۔

"مسٹر لیلادھر، کیا تم سو رہے ہو؟"

لیلادھر پچھلے کچھ منٹوں سے واقعی اونگھ رہا تھا اور ایا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا بن والی جا رہا تھا۔

"نو میڈم۔"

"ماضی کی یادوں سے بچنے کے لیے یہی بہتر ہے کہ سو جاؤ۔ مسٹر لیلادھر سو جاؤ تم۔"

"یس میڈم۔"

گفتگو کے یہ ٹکڑے سن کر ڈرائیور کو بھی ہنسی آ گئی۔ لیکن اُس نے اپنی ہنسی کو ہونٹوں ہی میں سمیٹ کر اُسے باہر آنے سے روک لیا۔ لیکن لیلادھر جو کچھ دیر سے اونگھنے لگا تھا ایک دم ایلرٹ ہو گیا۔ اب اُسے بھلا کہاں نیند آئے گی۔ اب تو وہ بس کانٹوں کی نوکوں پر ہی پڑا رہے گا۔ جانے یہ عورت اُسے عین اُس وقت کیوں ٹوک دیتی ہے جب وہ اپنے آپ سے ذرا سا

بھی غائب ہونے لگتا ہے۔

جب تک جیپ بن والی نہیں پہنچی رُدپا نے لیلادھر کو پھر نہیں ٹوکا۔ ڈرائیور نے بن والی کے چھوٹے سے ٹیلے کے پاس جیپ روک دی۔ رُدپا جب جیپ سے اتری تو آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے لوگ اُسے ریسیو کرنے کو موجود تھے۔ اُس نے تیلیوں والا ہیٹ سر پر لگا لیا اور اُس کے شانوں تک کھلے لمبے بال ہوا کے جھونکوں سے ایک دم لہرا گئے۔ لیلادھر بھی جیپ سے اتر کر اُس کے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ اور وہاں کھڑے دوسرے ملازموں سے رُدپا ٹھاکر کا تعارف کرا رہا تھا۔ پھر لیلادھر اس سارے ہجوم کے ساتھ آئے اُس ٹینٹ میں لے گیا جہاں اُنھوں نے کھدائی کے دوران نکلی مختلف چیزوں کو ترتیب سے رکھا تھا۔ ٹیلے کے نیچے کھلے میدان میں چوکور قسم کے نشانوں کے درمیان پاٹری کے جو نمونے اور ٹکڑے کھدائی میں نکلے تھے ڈھیر دلا کی شکل میں پڑے تھے، جن میں سے کچھ کو پہلی تھیلیوں میں بھی ڈال رکھا تھا۔ رُدپا دیر تک بڑے انہماک سے خیمے کے اندر رکھی چیزوں کو دیکھتی رہی تھی، جن میں پاٹری کے ٹکڑے، منکے، مٹی کی چوڑیاں، قیمتی پتھر، جو کے جل کر کالا ہوئے دانے اور دو فاسی لائیڈ انسانی کھوپڑیاں تھیں۔ اُس نے ہڑپا اور موہنجوڈارو کے زمانے کی وہ مہریں بھی دیکھیں جن میں آدھا دھڑ بیل کا تھا اور آدھا چیتے کا۔ لیلادھر اپنے تیز لہجے بھاری اور حلق سے نکلتی ہوئی دھونکنی کی سی آواز سے کھدائی میں برآمد ہوئی چیزوں کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔ پھر اُس نے ان تصویروں کے البم بھی دکھانے شروع کیے جو آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے فوٹوگرافر نے مختلف اوقات پر کھینچی تھیں۔

"یہ گاؤں کسی زمانے میں بڑا ہی پلینڈ رہا ہوگا" لیلادھر نے مزید وضاحت کی۔

"آپ تو کہتے تھے کہ آپ نے پانچ یا چھ ہزار سال پہلے کی کھدائی کی ہے۔ وہ دکھا دیجیے۔" لیلادھر رُوپا کو ساتھ لے کر ٹیلے کی طرف چلا۔ اُس کے ساتھ دوسرے لوگوں کے علاوہ درشن سنگھ فوٹوگرافر بھی تھا جو رُوپا کی تصویر پر تصویر لیے جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہیں یہ عورت ماڈل بن کر اپنی اچھی اچھی تصویریں نہیں کھنچوا رہی؟ دفتر کی فائلوں میں کیوں اپنا حُسن لٹا رہی تھی۔

"کچھ اچھی تصویریں نہیں تو مجھے بھیج دیں گا؟" اُس نے درشن سنگھ فوٹوگرافر سے کہا۔

"میڈم، آپ کی تو ہر تصویر اچھی ہو گی۔"

"او۔ ڈونٹ فلرٹ می۔" اُس نے زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، میڈم۔" درشن سنگھ نے جواب دیا اور رُوپا نے سامنے کھڑے لیلادھر سے پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے مسٹر لیلادھر؟"

لیلادھر بے چارہ تو درشن سنگھ فوٹوگرافر کی تصدیق بھی نہ کر سکا۔ وہ اتنا زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔

پھر وہ لوگ ٹیلے کی طرف بڑھے۔ لیلادھر اُنھیں کھدائی کی مختلف لیولز کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رُک گیا۔

"یہ مٹکا اناج کا ذخیرہ کرنے کے لیے رہا ہو گا۔"

مٹکا زمین میں دھنسا ہوا تھا اور اُس کے اندر بھی ہزاروں سال پہلے کی مٹی جمی تھی۔ پھر لیلادھر نیچے بیٹھ کر اُس زمانے کی اینٹوں کے حصّوں کو چاقو سے کھرچنے لگا اور بتانے لگا کہ ہڑپا کے دور کی اینٹوں اور ہڑپا سے پہلے زمانے کی اینٹوں کی ساخت میں کیا فرق تھا۔ ہڑپا سے پہلے والے دور کی اینٹیں سائز میں بہت بڑی تھیں لیکن ہڑپا کے زمانے کی اینٹیں بہت چھوٹی تھیں۔ پھر جب آگے بڑھ کر

لیلا دھر نے بتایا کہ گاؤں کے درمیان ایک دیوار بھی تھی جو عوام اور خواص کے گھروں کو تقسیم کرتی تھی تو رُوبا بول اٹھی۔

"آپ نے کیسے جانا کہ یہ دیوار صرف حفاظت کے لیے ہی تھی؟"

"ایسے ہی نشان ملتے ہیں میڈم!"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ نے اُس زمانے میں بھی عوام اور خواص کے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا کہ اب ہے۔"

"ایسا ہی نظر آتا ہے۔" لیلا دھر نے جواب دیا۔

"یہ سب CONJECTURES ہی تو ہیں۔"

"دراصل تو تمام انسانی تاریخ ہی CONJECTURES کی بنیاد پر قائم ہے سر۔" درشن سنگھ نے جواب دیا۔

"سر نہیں میڈم درشن سنگھ۔"

"سوری میڈم۔"

اس پر لیلا دھر کے سُوکھے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کی نمی پھیل گئی۔ اُسے اپنے فوٹوگرافر کی خفت پر بہت اطمینان ہوا تھا۔

کھدائی کے مختلف لیولز کو دیکھتے ہوئے اور ٹیلے پر گھومتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"مسٹر لیلا دھر ہڑپا تہذیب کے نشان اِدھر اُدھر کہاں ملے ہیں۔؟"

"میڈم راجستھان میں کالی بنگا کے مقام پر جو کھدائی ہوئی ہے اُس میں بھی اسی قسم کی چیزیں ملی ہیں۔"

"سب سے زیادہ قابلِ اعتماد نشان وہ کیا ہیں جن سے کسی تہذیب کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکتا ہے؟"

"پاٹری ہے میڈم اور ذہن پر بنے پیٹرن۔ لیکن سب سے زیادہ ٹھوس ثبوت ریلیز ہیں جو کھدائی کے وقت نکلی ہیں۔"

"یہ منکے اور چوڑیاں اور پتھر؟"

"یہ ٹھوس ثبوت نہیں، صرف اندازوں کو مضبوط کرنے میں مدد دیتے ہیں۔"

ٹیلے پر گھومتے ہوئے روپا نے محسوس کیا کہ ہوا گرم ہونے لگی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں شاید آندھی بھی آجائے۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ لیلادھر اب بہت تھک چکا تھا اور اس کی آواز اُس کے حلق کی دھونکنی میں اٹکنے لگی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اسی انداز سے ایک دن لیلادھر کچھ مدت پہلے اُس کے کمرے میں آیا تھا۔

"کیا بات ہے مسٹر لیلادھر؟"

"میری وائف کا اے بارشن ہو گیا ہے۔ چھٹی چاہیے میڈم۔"

"وائی ڈونٹ یو اسٹاپ دِس نان سینس؟"

"آئی شیل ٹرائی میڈم۔"

"وٹ ٹرائی۔ اپنی وائف کو لے جاؤ۔ گو اسٹریٹ ٹو دی فیملی پلاننگ سینٹر۔"

"یس میڈم۔"

"تھوڑا اینڈ تھینکس۔" روپا نے یہ کہتے ہوئے لیلادھر کی چھٹی منظور کر دی تھی اور جب وہ کمرے سے باہر نکلا تھا تو اُس نے رُوپا فقرہ کرتے یہ الفاظ سنے تھے۔ "وہاٹ اے سلی مین!"

اور اُسے لگا تھا کہ جو رائے اُس کی بیوی نے اُس کے بارے میں قائم کی تھی شاید وہ ٹھیک تھی۔

رُوپا جب بن والی سے لوٹی تو لُو چلنا شروع ہو گئی تھی اور بارش کے چھینٹے رات کو پڑے تھے اب اُن کا وجود بالکل ختم ہو چکا تھا۔ وہ جب ذرا اُٹھ کر

کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی تو درشن سنگھ نے کہا۔

"میڈم، میں آپ کی تصویریں ہفتہ بھر میں بھیج دوں گا۔"

"یو آر لٹ گڈ فوٹو گرافر بٹ اے فیسی چیپ۔"

پچھلی سیٹ پر بیٹھا لیلادھر اس بات پر بڑا کھل کر ہنسا۔

"لیلادھر کو اپنی برادری کا آدمی ملنے سے کتنی خوشی ہوئی ہے۔"

اب درشن سنگھ کا بلند قہقہہ گونجا اور جیپ اسٹارٹ ہو گئی اور قہقہے کی گونجیں جانے کھدائی کے کس کس حصّے سے ٹکراتی ہوئی اُن چوڑیوں ٹھیکریوں اور مٹی کے ڈھیر وں میں دفن ہو گئیں جہاں ایک پوری انسانی تہذیب سو رہی تھی۔

زرینا ٹھا کر جب واپس ریسٹ ہاؤس پہنچی تو وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔

"تھینکس مسٹر لیلادھر، یو کین گو۔"

اس سے پہلے کہ لیلادھر کوئی جواب دیتا وہ ریسٹ ہاؤس کے اندر چلی گئی اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اپنے بیگ میں سے مٹی کی چوڑیوں کے ٹکڑے، چھوٹے چھوٹے منکے، برتنوں کی ٹھیکریاں اور چھوٹا موٹا کباڑ خانہ سب اپنے سامنے پلنگ پر پھینک دیا اور اپنے سیاہ بال ایکدم پھیلا کر پیٹھ کے پیچھے ڈال دیئے۔

اُسے لگا جیسے وہ موہنجوداڑو اور ہڑپا کے زمانے کی ایک عورت تھی جس نے کئی جنموں کے بعد اب ایک بار پھر بیسویں صدی میں جنم لیا تھا اور پھر اُسے یاد آیا کہ شام تک اُسے دہلی پہنچنا تھا جہاں جیرڈ یدی اجمیر سے آ رہا تھا۔ آج کل اُس کی پوسٹنگ وہیں تھی وہ جانتی تھی کہ جیرڈ یدی پُرانی دہلی کے اسی پُرانے سے گھٹیا ہوٹل میں ٹھہرے گا جس میں وہ آج سے دس برس پہلے ٹھہرا کرتا تھا۔ اُن دنوں وہ انگریزی اخباروں میں رپورٹنگ کیا کرتا تھا اور اپنے کندھے سے کیمرہ لٹکائے

دربدر پھرتا رہتا تھا۔

وہ آج بھی کیمرہ کندھے سے لٹکائے روپا کا سواگت کرے گا اور اپنی گہری بھاری آواز میں کہے گا:

اُف یہ سنولائی ہوئی شام، یہ تیرا آنا۔

اور پھر ایگو کی ماری ہوئی روپا ٹھاکر، جسے دوسروں کو ستانے میں مزا آتا ہے، اس کی بانہوں میں ڈھل کر کچھ لمحوں کے لیے روپا چترویدی بن جائے گی اور اپنا وجود ایک دم وقت کی لہروں میں کھو دے گی، جس طرح کہ انسانی تہذیبیں وقت کے ساتھ اپنا وجود کھو دیتی ہیں۔

فاصلہ

ایر انڈیا کے ہوائی جہاز میں جب وہ سوار ہوا تو باہر بلا کی سردی تھی۔
پالم ہوائی اڈے کی عمارت کے بے حد چمکتے ہوئے فرش پر اس کے بوٹ
کئی بار رپٹے۔ وہ کئی بار گرتے گرتے بچا۔ باہر ہوا بہت تیز تھی اور ہلکی ہلکی
بارش ہو رہی تھی۔ وہ جب PASSENGERS LOUNGE سے
باہر نکل کر اپنا سامان دیکھنے کے لئے باہر گیا تو سردی کی ایک تیز لہر اس کے جسم میں
دوڑ گئی اور ایک بار تو سردی سے اس کے دانت بھی ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔
اندھیرے میں اُسے اپنا سامان نہیں مل رہا تھا۔ اتنے سارے مسافر تھے اور
سب بوکھلائے ہوئے سے لگتے تھے اور جلدی میں ایک دوسرے سے ٹکرا
رہے تھے۔ وہ اس تمام بوکھلاہٹ سے بیزار ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا
اور سگریٹ پینے لگا۔ وہ دیا سلائی جلا کر اپنی لگیج چٹ پر لکھے نام کو پڑھنے
کی کوشش بھی کر سکتا تھا لیکن یہ ٹھنڈی ہوا، بارش کے قطرے اور اندھیرا اور
پھر مسافروں کی یہ بوکھلاہٹ۔ وہ ایک دم چیخ اٹھا۔ ہوائی جہاز میں سفر
کرنے والے مسافر بھی اس قدر غیر تہذیب یافتہ ہوتے ہیں۔ بسوں اور ریل گاڑی
کے تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں ٹھسے ہوئے عوام میں اور ان اعلیٰ سطح کے مسافروں

میں کتنی مناسبت تھی۔ ویسی ہی جیسی دو جڑواں بچوں میں ہو سکتی ہے۔ لوگ ایک خاص قسم کے حالات میں بالکل ایک ہی طرح سے ری ایکٹ کرتے ہیں۔ رنگ۔ نسل۔ تعلیم۔ طبقہ یہ بھی خارجی عامل ایک۔۔۔ ذم صفر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک عام عورت بھی ایک خاص طرح کے ماحول میں کیسی بن سکتی ہے اور ایک کیسی بھی مختلف قسم کے حالات میں ایک نارمل عورت میں ڈھل سکتی ہے۔

سگریٹ کا ایک بہت ہی لمبا کش لیتے ہوئے یہ خیال اُسے کیوں آیا۔ اُس کے پاس اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ لیکن خیال آیا ضرور تھا اور یہ خیال اسے مادھوری کو دیکھ کر آیا تھا جو اسی ہوائی جہاز سے سفر کر رہی تھی اور اُسی کی ٹیم کی ایک ممبر تھی۔ اور جس سے وہ پانچ برس کے بعد اچانک آج ملا تھا۔ اُسے ایسا نہیں سوچنا چاہیئے تھا۔ مادھوری کا اس سے جھگڑا تو پانچ برس پہلے ہوا تھا۔ اب اسے شاید وہ بات یاد بھی نہ ہو۔ اس لئے اتنی پرانی بات کو لے کر اُس کے بارے میں اس ڈھنگ سے سوچنا درست نہیں تھا۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ اور سامان کو دیکھنے کا خیال ترک کر کے تھوڑی دور پر کھڑے ہوائی جہاز کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی اس نے چند ہی قدم اٹھائے تھے کہ اسے محسوس ہوا کہ بارش میں بھیگتی ہوئی مادھوری اُس کے قریب آ گئی تھی۔

"آپ نے اپنا سامان دیکھ لیا؟"

"نہیں۔ میرے پاس کوئی بھی ایسی قیمتی چیز نہیں جو گم ہو سکتی ہو۔"

"دیکھنے میں کیا حرج تھا۔؟"

"میں اس بوکھلائی ہوئی بھیڑ کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔"

"میں نے سوچا تھا کہ آپ ان برسوں میں بہت کچھ بدل گئے ہوں گے۔"

"بدن کے لئے تو ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے مس مٹو۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"لیکن ہر شخص کے لیے نہیں۔ کم سے کم میرے لئے نہیں۔"

"آپ اپنے آپ کو ہمیشہ ہی دوسروں سے مختلف سمجھتے ہیں۔"

"مختلف اور الگ بھی۔ اور ایک دم کٹا ہوا سا۔"

"بہت ایگو (ego) ہے آپ میں۔؟"

"ہاں۔ آپ اپنا سامان دیکھیں۔ بہت قیمتی ہیں آپ کی چیزیں۔"

"آپ کی طرح شراب کی خالی بوتلیں نہیں ہوتیں میرے پاس۔"

مادھوری یہ طنز کرتی ہوئی چلی گئی اور کیشو کو پانچ سال پرانے سانحے کی تپتی ہوئی ریت پر دھکیل گئی۔ بارش کے ٹھنڈے قطرے، سرد ہوا، اور ماضی کی تپتی ہوئی ریت۔ کیشو کو لگا، جیسے ہوائی اڈے کی عمارت کے فرش پر جو بوٹ رپیٹے تھے وہ اب اس کے پیروں میں نہیں تھے۔ وہ ننگے پاؤں گھوم رہا تھا۔ اور بھٹی کی طرح سلگتی ہوئی ریت اس کے تلوؤں کو جھلس رہی تھی۔

پانچ برس پہلے۔

راجستھان کا ایک وسیع سرکاری ریسٹ ہاؤس۔

اور دو بے حد پئے ہوئے آدمی۔

اور پھر ریسٹ ہاؤس کی ایک کھڑکی۔

کھڑکی سے جھانکتی ہوئی ایک خوبصورت عورت

اور سڑک پر لڑھکتی ہوئی کیسر کستوری کی ایک خالی بوتل۔

اتنے سارے عناصر تھے جن سے اُس سانحے کی رُوپ ریکھا بنی تھی۔

کیشو ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل آیا تھا۔ کیونکہ اندر بڑا حبس تھا۔ ہوا

ایکدم مند تھی اور اُس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اُس نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ صبح انھیں بہت سویرے اٹھ کر چتر گڑھ جانا تھا اس لیے یہ ضروری تھا کہ رات دیر تک نہ جاگا جائے۔ لیکن کیسر کستوری کی مہک ابھی تک اس کے ذہن میں تھی اور باہر نہایت ہی خوبصورت چاندنی تھی اور اندر بے حد گرمی تھی، اس لیے سونا ناممکن تھا۔ شاید یہی حال اس عورت کا بھی تھا جو ریسٹ ہاؤس کے ایک دوسرے کمرے میں تھی اور پریشان تھی اور اپنے آپ سے بیزار ہو کر اب سڑک پر کھلتی ہوئی کھڑکی میں کھڑی آگ برساتی ہوئی چاندنی کو دیکھ رہی تھی اور اُس چاندنی میں نیچے چمکتی ہوئی سڑک کو بھی دیکھ رہی تھی۔ چونکہ اس کا کمرہ ریسٹ ہاؤس کی دوسری منزل پر تھا اس لئے وہ چاند سے زیادہ قریب تھی اور سڑک سے نسبتاً اتنی ہی دور۔

اور کیشو جب سڑک پر پہنچا تو دو آدمی نشے میں مست آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ وہ جھگڑا ویسا ہی تھا جیسا کہ دو بدمست آدمیوں میں ہوتا ہے۔ بالکل سطحی قسم کا جھگڑا، جس میں ذہن اور ادراک بالکل شامل نہیں ہوتے اور وہ سطحی جھگڑا سڑک کی چمکتی ہوئی سطح پر ہو رہا تھا۔ عین اُس کھڑکی کے نیچے جس میں وہ عورت جس کا نام مادھوری مشرا تھا، کھڑی تھی اور سڑک پر کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آدھی رات کے وقت کوئی عورت اس طرح کھڑکی میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ خود کیشو کو بھی نہیں۔ کیونکہ وہ جب دھرتی پر چلتا تھا تو اس کی نگاہیں دھرتی پر ہی جمی رہتی تھیں، آسمان پر نہیں۔ اُس لمحہ اُسے دھرتی آسمان سے زیادہ حسین اور زیادہ بہتر نظر آتی تھی۔

اور جب کیشو سڑک کے عین درمیان پہنچا تو وہ بدمست آدمی بداخلاقی پر اتر آئے تھے اور ایک دوسرے کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے تھے۔ ایک

کے ہاتھ میں گلاس تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں خالی بوتل۔ گلاس والے آدمی
نے بیچ سڑک میں گلاس پھینک دیا تو چھن سے ٹوٹ گیا اور شیشے کی کرچیاں
چاندنی میں چمکنے لگیں، بلکہ ہر کرچی ایک چاند بن گئی۔ لیکن یہ چاند کیشو کو نظر نہیں
آئے۔ البتہ مادھوری نے انہیں اپنی کھڑکی سے دیکھ لیا۔ کیشو کو تو صرف وہ
بوتل نظر آئی جو دوسرے آدمی نے ایک بار منہ کے ساتھ لگا کر سڑک پر لڑھکا
دی تھی اور جو لڑھکتے لڑھکتے اس کے پاؤں سے آٹکرائی تھی۔

بوتل پھینکنے والے آدمی نے دوسرے آدمی سے کہا۔

"وہ جا رہی ہے تیری ماں، پکڑ لے اس کو۔"

اور دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

"تیری بہن کا تو سب کچھ بیچ سڑک میں ٹوٹ گیا ہے۔" اس کا اشارہ ٹوٹے
ہوئے گلاس کی طرف تھا۔

کیشو جو خود بھی بہکے سے موڈ میں تھا انہیں سمجھانے کے لیے آگے بڑھا تو
اوپر کھڑکی سے آواز آئی۔ "اب آپ بھی شروع ہو جائیں نا۔ چپکے سے گیٹ کے اندر آ جائیے۔"
یہ آواز مادھوری کی تھی اور ایکدم غائب بھی ہو گئی۔

"شٹ اپ، بڈھی ماں۔" کیشو نے کھڑکی کی طرف گردن اٹھا کر تیکھے لہجے میں کہا۔

"تو آ جا بیٹے — " آواز دوبارہ گونجی۔

اس سے پہلے کہ کچھ ہو پاتا ان دونوں آدمیوں نے کھڑکی میں [illegible]
گالیاں دینی شروع کر دیں۔ کھڑکی کے پٹ بند ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی
وہ دونوں گالیاں بکتے ہوئے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے آگے نکل گئے۔
اور کیشو گلاس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا اور پھر خالی بوتل کو پاؤں
سے ٹھوکر مار کر گیٹ کھول کے اندر چلا گیا۔

دوسری صبح چتوڑگڑھ روانہ ہونے سے پہلے مادھوری منوکیشو کی دشمن بن چکی تھی۔

اور کیشو جب راجستھان سے واپس آیا تو اپنے ساتھ درجن بھر سے زیادہ شراب کی خالی بوتلیں لے آیا اور انھیں رکھا بھی ایک خالی ٹوکری میں تاکہ سب کی نظر اُن پر پڑے اور جب اس کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

"کیشو صاحب یہ خالی بوتلیں کس لئے ساتھ لے جا رہے ہو؟"

"کسی حسین لیکن جاہل عورت کو پیش کرنے کے لیے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا اور یہ جملہ اس نے اتنے اونچے لہجے میں کہا تھا کہ مادھوری کے کانوں میں سیدھے پگھل کر رہ گیا تھا۔

کیشو نے جب ماضی کی دہکتی ہوئی ریت سے جھلسے ہوئے اپنے پاؤں کو آہستہ سے ہلایا تو اُس وقت وہ ہوائی جہاز کے اندر اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور اس کے بائیں پہلو میں بیٹھی ہوئی مادھوری مینو اپنی بیلٹ ٹھیک کر رہی تھی۔ اگر اُسے پہلے معلوم ہو جاتا کہ مادھوری اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے گی تو وہ اپنی سیٹ ٹیم کے کسی اور ممبر سے بدل لیتا۔ مادھوری جیسی خوبصورت عورت کے ساتھ تو ہر کوئی بیٹھنا چاہتا تھا۔ شاید اسی کارن سبھی ممبر دل ہی دل میں کیشو سے جل رہے تھے اور انھیں معلوم نہیں تھا کہ کیشو اور مادھوری کے درمیان ماضی کی تپتی ہوئی ریت کا ایک صحرا بھی اُگ آیا تھا۔

مادھوری سے بیلٹ بند نہیں ہو رہی تھی اور ہوائی جہاز اڑان بھرنے والا تھا۔ وہ بے حد پریشان ہو رہی تھی۔ اُس کے گورے چہرے پر ایک زرد سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ گورے چہرے میں ایک یہی تو نقص ہے۔ جذبات کی ایک ہلکی سی رمق بھی اپنی پرچھائیں چھوڑ جاتی ہے۔ اُس نے مڑی ملتجی نظروں سے

کیشو کی طرف دیکھا۔

"کڈ یو ہیلپ می پلیز؟"

کیشو کو لگا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا انسان مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اس نے بغیر جواب دیئے، بیلٹ کے بکل کو سیدھا کیا جسے مادھوری نے جلدی میں الٹ دیا تھا اور اس لئے بند نہیں ہو رہا تھا۔ بکل کو سیدھا کر کے اس نے مادھوری کی کمر میں بیلٹ فکس کر دی۔

ڈوبتا ہوا آدمی بچ گیا تھا۔

چہرے پر چھائی ہوئی درد کی بدلی چھٹ چکی تھی۔

"تھینکس ۔۔" مادھوری نے شکریہ کہا۔

اور کیشو بنا کچھ بولے بالکل ویسے ہی اسے گھورتا رہا جیسے وہ ایک بے جان ڈھنڈ تھا جسے تھام کر ڈوبتی ہوئی مادھوری بچ گئی تھی۔

اندھیرا چھا گیا۔ اڑان بھر گیا اور سامنے والی بتی بجھ گئی اور مسافروں نے اپنے اپنے بیلٹ کھولنے شروع کر دیئے اور لمحہ بھر سارے جہاز میں دھم دھم بیلٹ کھلنے کی آواز ابھرتی رہی۔

اور کیشو نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ میں ڈوب گیا۔ جب بھی وہ پریشان ہوتا تھا، ایک دم اپنے آپ کو اپنے ماحول سے ڈس کنیکٹ کر کے خود میں کھو جاتا تھا اور آنکھیں بند کر کے اپنی تمام قوتوں کو اکٹھا کر لیتا تھا۔ ایسے لمحے اس کے لیے بڑے اذیت ناک ہوتے تھے۔ اپنی شخصیت کے تمام انتشار کے کنکروں کو چن چن کر ایک مرکز پر جمع کرنا اور پھر کسی خارجی جھکڑ کے ریلے کو بھی روکے رکھنا جو ان کنکروں کو اڑا کر پہلے سے بھی زیادہ دور پھینک دے، بڑی تکلیف دہ مرحلہ ہوتا تھا اور اسے ایسے مرحلے اکثر پیش آتے تھے اور ان لمحوں میں وہ ایکدم

بے جان ہو کر رہ جاتا تھا۔ لیکن اُس کی بقا کے لئے یہ سارا پروسیس بہت ضروری تھا۔ اس پروسیس میں سے گزرنے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنی ذہنی جولی شخصیت کو مکمل کر لیتا تھا اور اُسے مختلف زاویوں سے یوں دیکھتا تھا جیسے کوئی فن کار اپنی تصویر کو مکمل کر چکنے کے بعد اس کے چاروں طرف گھوم پھر کر ہر پہلو ہر زاویے سے دیکھے اور تسلی کرے کہ اس کی تصویر واقعی مکمل ہو چکی تھی۔

ہوائی جہاز کی نہایت ہی آرام دہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے جب وہ اس اذیت ناک پروسیس سے گزر چکا اور آنکھیں کھول کر اپنے ماحول کو پہچاننے لگا تو اس نے دیکھا کہ اس کے بائیں پہلو والی سیٹ میں بیٹھی مادھوری سو رہی تھی اور اس کا دایاں ہاتھ انجانے میں اس کی آغوش میں آگرا تھا۔ وہ لمحہ بھر اس خوبصورت گورے ہاتھ کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے بڑی نرمی سے اس گورے ہاتھ کو اٹھا کر مادھوری کی آغوش میں رکھ دینے کی کوشش کی اور اس کوشش میں مادھوری جاگ گئی اور اس نے مسکرا کر کہا۔

"آئی ایم سوری!"

کیشو نے اُسے فقط تھوڑی دیر غور سے دیکھا اور خاموش رہا۔

مادھوری خوبصورت لگ رہی تھی۔

مادھوری کشمیری پنڈت تھی اور اس کا حسن کشمیر کے حسن کی نمائندگی کر رہا تھا۔

ایئر ہوسٹس آئی تھی مادھوری کی سیٹ کے قریب۔

"وڈ یو لائک ٹو ہیو سم ڈرنکس؟"

"وِسکی فار ہِم اینڈ بیئر فار می۔"

مادھوری نے کیشو کی طرف دیکھتے ہوئے ایئر ہوسٹس کو جواب دیا۔

"کونسی تحریر؟"

"جو خدا ہر حسین تخلیق کرتے وقت اُس کے ماتھے پر لکھ دیتا ہے۔ خدا بڑا حسن پرست ہے۔"

"اسی لئے تو وہ تم جیسے لوگوں کو جنم دیتا ہے۔"

کیٹی ہنس پڑا۔

مادھوری شرما گئی۔

ہنسی اور شرم کی ان ہلکی ہلکی لہروں میں وقت اور فاصلہ کب بہہ گیا، یہ اُن دونوں میں سے کسی نے بھی نہ جانا۔

وقت اور فاصلہ جو انسانی زندگیوں میں بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

وقت اور فاصلہ جن سے تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔

اناؤنسر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں ہم نیروبی ہوائی اڈے پر پہنچ رہے ہیں۔ اپنی اپنی بیلٹس فکس کر لیجئے۔ شکریہ۔

مادھوری نے اپنے سامنے جلتی روشنی کو دیکھا جس کے ذریعہ بیلٹس فکس کرنے کی ہدایت دی جا رہی تھی اور اُس نے اپنے دونوں پہلوؤں میں سے بیلٹ کے حصّوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

"مے آئی ڈو اٹ فار یو؟"

"نو تھینکس۔" مادھوری نے جواب دیا۔

نیروبی ایئرپورٹ آگیا تھا۔

مسافر اپنا اپنا مختصر سامان لئے اپنی سیٹوں سے اُٹھنا شروع ہو گئے تھے۔

اُن کی قطار میں آخری سیٹ پر بیٹھا مسافر بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

کیشو اور مادھوری دونوں ابھی بیٹھے تھے۔

وہ بیٹھے رہے جب تک کہ دوسرے مسافر ایگزٹ کی طرف نہیں بڑھ گئے۔

جب وہ دونوں ہوائی جہاز کے ساتھ لگی سیڑھیوں سے اترنے لگے تو انہیں سرو کرنے والی ایئر ہوسٹس نے مسکرا کر خدا حافظ کہا۔

"گڈ نائٹ - ہرٹ ٹِز نٹ سرو یو سَفٹ ڈرنکس ٹو - پسنجرز۔"

تینوں ایئر ہوسٹیس جو پاس پاس کھڑی تھیں ہنس پڑیں۔ اور کیشو مادھوری کے گورے بازو پر ہاتھ رکھے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔

باہر اندھیرا تھا اور نیروبی ایئرپورٹ کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔

سُرخ مکان

میرا نام کُسُم ہے۔ کُسُم نارنگ

میں دسویں جماعت میں پڑھتی ہوں۔

میری عمر اب فروری میں سولہ برس ہو جائے گی۔

میرے ڈیڈی اکاؤنٹس آفس میں ہیڈ کلرک ہیں اور بہت خشک آدمی
ہیں۔ وہ بہت ہی کم بولتے ہیں۔ بات کرنے میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
جواب طلب کر رہے ہوں۔ لیکن ممی سے بہت دبتے ہیں۔ میری ممی یوں تو دسویں فیل
ہیں لیکن سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایف اے پاس ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لاہور کے
کسی بہت ہی اچھے کالج کا نام لیتی ہیں۔ لاہور سے مجھے کوئی واقفیت نہیں۔ اتنا جانتی
ہوں کہ وہ پاکستان میں ہے اور پچھلے ستمبر میں اخباروں میں اس کا بہت ذکر آیا
تھا جب پاکستان کا ہم سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی لاہور ریڈیو اسٹیشن سے
پنجابی کے گیت سنا کرتی ہوں۔ پنجابی گیت مجھے بہت پسند ہیں۔ ان میں ڈھولا، ماہی اور گورڈیے
کے لفظ بہت اچھے لگتے ہیں۔

میرا ایک چھوٹا بھائی ہے جس کی عمر دس برس ہے۔ اُسے پتنگ بازی کا بہت
شوق ہے۔ اسکول سے آتے ہی پتنگ اور ڈور لے کر تیسری چھت پر چڑھ جاتا ہے۔

ممی اور ڈیڈی کا سونے کا الگ کمرہ ہے۔ دو ساتھ ساتھ جڑے ہوئے پلنگوں پر ایک ہی سائز کا ڈبل بیڈ کور بچھا رہتا ہے۔ رات کو بستر بچھانے کا کام میرے ذمے ہے۔ میں جب اُس بڑے سے بیڈ کور کو دونوں پلنگوں سے اٹھا کر تہہ کرتی ہوں تو پلنگوں پر بچھی سفید چادریں جیسے جگمگا اٹھتی ہیں۔ اس لمحے نہ جانے کیوں میرے سارے جسم میں ایک لہر سی تھرک گئی ہے اور میرے ماتھے پر پسینہ اُبھر آیا ہے اور میرے گال تمتما اُٹھتے ہیں۔

میں اور منّی دوسرے کمرے میں سوتے ہیں۔ یہی ہمارا پڑھنے کا بھی کمرہ ہے۔ اکثر منّی مجھ سے پہلے ہی سو جاتا ہے۔ میں ذرا دیر سے سوتی ہوں۔ ان دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ دروازہ کھلا رہا کرے۔ حالانکہ ایک موٹا سا پردہ بھی ہے پھر بھی ممی دروازہ اندر سے بند کر کے سوتی ہیں۔ مجھے کئی بار اکیلے میں ڈر معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر اُن راتوں میں جب بارش ہو رہی ہو اور بجلی زور سے کڑکتی ہو۔ اُس وقت میرا دل کانپ اٹھتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ لپک کر ممی کے بستر میں گھس جاؤں اور اُن سے لپٹ جاؤں۔ لیکن دروازہ اندر سے بند رہتا ہے اور میں بے بس ہو کر رہ جاتی ہوں اور میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ سچ مانیے اس وقت میں اپنی ممی کو دنیا کی ان ماؤں میں گنا کرتی ہوں جو اپنے بچوں کے لیے اتنی بھی قربانی نہیں کر سکتیں۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے جب چمکتی ہوئی بجلی نظر آتی ہے تو ممی پر بے حد غصہ آتا ہے۔ کبھی کبھی جب کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہو اور رضائی میں ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے ہوں تو منّی کہتا ہے۔

”کسم دیدی میں تمہارے بستر میں آجاؤں؟“

”نہیں، اپنے بستر میں پڑے رہو۔“

”بہت ٹھنڈ لگ رہی ہے نا!“

”تو ممی کو آواز دو۔“

"نہیں ممی ناراض ہوں گی۔"

"تو رضائی کو اِدھر اُدھر سے اچھی طرح دبا کر سو جاؤ۔"

"پھر بھی ٹھنڈ لگتی ہے دیدی۔"

اُس کے بعد میں کوئی جواب نہیں دیتی اور ٹمی اپنے بستر سے اٹھ کر چپ چاپ میرے بستر میں دبک جاتا ہے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں واقعی یخ ہو رہے ہوتے ہیں مجھے بے چارے پر بہت ترس آتا ہے اور ممی پر بے حد غصہ جسے اپنے بچوں کا ذرا بھی خیال نہیں۔ وہ میرے ساتھ لگ جاتا ہے مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا اور پھر دھیرے دھیرے اُس کے ٹھنڈے جسم میں گرمی آ جاتی ہے۔ ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب ٹمی کے جسم کے میرے جسم سے لگنے پر ایک گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ ایک عجیب طرح کی تھرکن سی۔ میں اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتی۔ نہ جانے یہ کیفیت کیسی ہے؟ من کی یہ حالت کیا ہے؟ یہ اضطرار اور تھرکن کیوں ہے؟ اکثر دل میں ایک الجھن سی رہتی ہے۔

مجھے فلمیں دیکھنا اور ناول پڑھنا بھی اچھا معلوم ہوتا ہے اور کبھی کبھی کسی فلم کے کسی منظر کو دیکھ کر یا ناول کے کسی صفحے کو پڑھتے ہوئے بھی میرے دل کی حالت کچھ ایسی ہو جاتی ہے۔ نہ جانے یہ سب کیا ہے؟ کئی بار تو بیٹھے بیٹھے جی ایک دم اُداس ہو جاتا ہے اور دل چاہتا ہے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں۔ کبھی کبھی دل میں اتنی گھٹن ہوتی ہے کہ سب سے نفرت ہونے لگتی ہے اور کبھی کبھی تو دل بے تحاشہ خوش ہو اٹھتا ہے اور اپنے ارد گرد کی تمام چیزیں سُندر اور پیاری معلوم ہونے لگتی ہیں۔ کئی بار تو پڑھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ بس بیٹھے رہنے اور بے کار کی باتیں سوچنے کو ہی دل چاہتا ہے۔ یہ عجیب و غریب متضاد کیفیتیں کبھی کبھی اتنی ناقابلِ برداشت ہوتی ہیں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بیمار ہوں اور مجھے اپنا علاج کرانا چاہیے۔ لیکن علاج تو جب ہو جب میں کسی کو کچھ بتاؤں۔ میری سہیلیاں آپس میں ایسی باتیں کرتی ہیں کہ مجھے شرم آنے لگتی ہے۔ میں اُن کے پاس بیٹھنا تک نہیں چاہتی۔ اسی لیے میری کوئی

سہیلی نہیں، کوئی دوست نہیں، کوئی رازدار نہیں۔ ممی ڈیڈی کو میری پرواہ نہیں کرتے۔ محلے
میں میری عمر کی کوئی لڑکی نہیں، جسے میں اپنا دوست بناؤں۔ اسکول کی لڑکیاں بہت چھچھوری
باتیں کرتی ہیں جو مجھے پسند نہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سارا زمانہ میرا دشمن ہے
میرا کوئی اپنا نہیں مجھے کوئی پیار نہیں کرتا۔ میں ایک دم اکیلی ہوں۔ اکیلی اور بے آسرا!
اور رہ رہ کے چھوٹے چھوٹے وسوسے مجھے گھیرتے رہتے ہیں۔
محسوس ہوتا ہے جیسے میں پاگل ہو جاؤں گی۔

اور کچھ دنوں سے مجھے پاگل بنا دینے پر تلا ہوا ہے وہ سامنے والا سرخ مکان!
جہاں نیرا رہا کرتی تھی۔ یہی تو ایک لڑکی تھی اپنے محلے کی جو مجھے پسند تھی۔ اُس کے ڈیڈی بھی
اکاؤنٹس آفس میں کام کرتے تھے۔ لیکن میرے ڈیڈی جیسے نہ تھے۔ جب بادشاہوں کی طرح
کھلے ہوئے۔ نیرا کی ممی بھی بہت اچھی تھیں میری ممی کی طرح مغرور نہیں۔ بہت حلیم اور پیار
کرنے والی۔ نیرا کے گھر جا کر مجھے بہت سکون ملتا تھا۔ میں بغیر کوئی وجہ بتائے نیرا کے ساتھ
لگ کر کئی بار روئی ہوں، لیکن جب بھی اس نے اپنے آنچل سے میری گیلی آنکھیں پونچھیں
ہیں مجھے چاندنی سے دھلی ہوئی خوشگوار دھوپ کا احساس ہوتا ہے اور کئی دنوں
سے وہ دھوپ اتر گئی ہے اور میرے دل کے آنگن میں گھنے اور ٹھنڈے سائے پھیل
گئے ہیں۔ جیسے گھپ اندھیرا ہونے لگا ہو۔ نیرا کے ڈیڈی کچھ مہینے ہوئے تبادلہ
ہو کر چلے گئے تھے۔ جب تک مکان کا بندوبست نہ ہوا نیرا اور اس کی ممی یہیں رہیں اور پھر ایک
دن اُن کے سامان سے بھرا ٹرک اسی گلی سے ہو کر چلا گیا۔ اس دن نیرا اور اُس کی ممی نے
ناشتہ ہمارے ہی یہاں کیا اور پھر نیرا اور میں جی بھر کے روئیں اور پھر نیرا چلی گئی اور سامنے والے
مکان کے برآمدے میں کھلتے ہوئے دروازے میں تالا پڑ گیا۔ مالک مکان کا تالا ابھی
جب بھی گیٹ کے سامنے سے گزری میری نگاہ اس بڑے سے پرانے تالے پر پڑ
پڑی اور مجھے محسوس ہوتا جیسے اب تالا کبھی نہ کھلے گا۔ ادھر سے گزرتے ہی میری آنکھیں

ڈھونڈھ جاتیں۔ نیرا نے ایک بہت ہی طویل اور پیارا خط لکھا تھا جس کا میں نے جواب بھی
دیا تھا اور اُس کے مکان کے سامنے لان میں کھلے ہوئے موتئے کی کلیاں بھی لفافہ میں ڈال کر
بھیجی تھیں اور لکھا تھا۔

"تم کرسمس کی چھٹیوں میں یہیں آجاؤ۔ کچھ دن ساتھ گزاریں گے تمہیں
حفاظت سے واپس پہنچانے کا ذمّہ میرا! مانا کہ تم بہت خوبصورت ہو
لیکن تمہاری سُندرتا کوئی چرا لے گا نہیں ہے۔"

یہ آخری سطریں بھی میں نے کسی ناول میں پڑھی تھیں اور اُن کا استعمال نیرا کے لیے کر ڈالا
تھا لیکن نیرا نہیں آئی تھی اور مجھے بہت دُکھ ہوا تھا۔ میں نے اپنے خط میں اُسے جی بھر کر کوسا تھا۔
دو ایک خط اور آئے تھے نیرا کے اور اُس کے بعد تو اُس نے میرے بھی تین خطوں کا جواب نہ دیا تھا۔
اُس پیاری سی لڑکی کو کئی اور پیار کرنے والی لڑکیاں مل گئی ہوں گی، اسی لیے شاید وہ مجھے بھول گئی تھی۔
اور میں اکیلی میں پہلے تھی ویسی ہی اکیلی اور بے سہارا میں پھر بن گئی تھی۔ اب میں نیرا کے چھوڑے ہوئے
مکان کے سامنے سے گزرتی تھی تو اس کے گیٹ کی طرف دیکھتی نہ تھی۔ اُس مکان، اُس کے آنگن،
اُس میں اُگے ہوئے خوبصورت پھولوں اور اُس کے نیلے گیٹ سے جیسے اب میرا کوئی واسطہ نہ رہا
تھا۔ میں اس سے ایک دم بے نیاز ہو گئی تھی۔ پھر کبھی رات کو اپنی کھڑکی سے نیرا کے کمرے کی بند کھڑکی
نظر آجاتی تو من کو دُکھ ہوتا۔ جب نیرا یہاں تھی تو ہم دونوں ایک ہی وقت اپنی کھڑکی
بند کیا کرتی تھیں، ایک ہی وقت اپنی گھڑیوں کو چابی دیا کرتی تھیں۔ ایک ہی طرح کے رومال ہوتے
تھے ہمارے، اور ایک ہی طرح کی چوڑیاں۔ میں تو اب اپنی گھڑی کو رات کے دس بجے ہی چابی دیتی
ہوں لیکن نیرا نے اپنی گھڑی کی چابی کا وقت بدل لیا ہو تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میرے رومال اب
بھی ویسے ہی ہیں جیسے نیرا کے تھے اور میری چوڑیوں کا رنگ بھی وہی ہے لیکن ہو سکتا ہے نیرا نے
اپنے سارے انداز بدل لیے ہوں اور میرے خطوں میں بھیجی ہوئی موتئے کی کلیاں سوکھ گئی ہوں۔
اور اُس کا مجھ سے اور میری یادوں سے رشتہ ٹوٹ گیا ہو۔

ہو سکتا ہے ایسی باتیں میں صرف اس لئے کر رہی ہوں کہ میں نے انھیں ناولوں اور کہانیوں میں پڑھا ہے۔ ورنہ شاید نہ ہوتیں تبھی تو مجھی نہیں ہے سب بہار دور بہاؤں۔
ابھی نیرا کی پرچھائیں سے میرا ذہن صاف نہیں ہوا تھا کہ سامنے والے سرخ مکان میں کئی روز سے ایک اور پرچھائیں آ گئی ہے۔ میرا دماغ اور بھی الجھ گیا ہے۔ میرے مسئلے اور بھی پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ میرے دل میں کئی ڈر پھر سے جاگ اٹھے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ سرخ مکان ایک سانپ کی طرح میرے ساتھ چمٹ گیا ہے۔ لاکھ دور پھینک دینے سے بھی الگ نہیں ہوتا۔

منی بتا رہا تھا ممی کو۔

"نیرا والے مکان میں کوئی اور کرایہ دار آ گیا ہے۔"

"کب؟"

"آج ہی کسی کا سامان اترا ہے۔ اتنا سامان کہاں رکھیں گے وہ؟"

"تمہارے سر میں!" میں نے چیخ کر کہا تھا۔

اور پھر منی ہی خبر لایا تھا کہ نیرا کے مکان میں صرف ایک آدمی اور ایک بڑھیا آئی ہے۔ کوئی لڑکا، لڑکی یا عورت نہیں تھی۔ اسے بہت افسوس ہو رہا تھا۔ نیرا سے تو منی کی خوب پٹتی تھی۔ اب تو وہ اس مکان میں نہ جا سکے گا۔ بھلا بڑھیا سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا تھا اور اس آدمی سے جو غالباً اس کا بیٹا ہوگا۔ اس رات نیرا والے کمرے کی بند کھڑکی کئی دنوں بعد کھلی تھی۔ رات کو اس میں روشنی بھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ دس بجے سے بجھ گئی تھی۔ نہ جانے کس وقت کھلی تھی۔ کھڑکی میں سے نہ تو نیرا کا کوئی رنگدار دوپٹہ ہی نظر آیا تھا، نہ اس کا چہرہ، نہ اس کی چوٹیاں۔ کچھ بھی تو نہیں صرف سلگتے ہوئے سگریٹ۔ اندھیرے کمرے میں ایک ہی جگہ پر ٹکے ہوئے جگنو کی طرح۔ نہ جانے کیسے پاگلوں کی طرح میں سوچنے لگی کہ نیرا جگنو بن کر اپنے چھوڑے ہوئے کمرے کو دیکھنے آئی تھی اور اب وہاں ٹھہر کر چمک رہی تھی۔

میں سوچتی رہی کہ یہ سامنے والا سرخ مکان مجھے ضرور پاگل بنا ڈالے گا۔

دیکھتی ہوں اور اس کے ستار کا نغمہ سنتی ہوں۔

میں کھڑکی سے لگ کر بستر پر لیٹ جاتی ہوں۔ ستار کا نغمہ گونجتا رہتا ہے اور اس کے کمرے کی بتیاں جلتی رہتی ہیں۔ ایسے ہی کسی وقت مجھے نیند آجاتی ہے۔

میں اس آدمی کا نام تک نہیں جانتی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا کام کرتا ہے، کہاں کا رہنے والا ہے۔ لیکن پھر بھی میرے ذہن کی الجھنوں میں ایک اور الجھن کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بالکل نہیں جانتا۔ وہ بھی تنہا ہی ہے۔ صبح سویرے سفید کھدر کا کرتا پاجامہ پہنے وہ گیٹ کے ساتھ لگا کھڑا سگریٹ پیتا ہوتا ہے اور نہ جانے کس کو سڑک پر کسے دیکھتا رہتا ہے۔ میں جب اسکول جانے کے لیے گیٹ کے سامنے سے گزرتی ہوں تو میرا دل زور زور سے دھڑکتا ہے اور میرے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ لیکن وہ مجھے نہیں دیکھتا، بس دیکھ کر نظریں پھیر لیتا ہے۔ بلکہ گھورتا رہتا ہے۔ وہ سامنے والی سڑک کو تکتا رہتا ہے اور جب میں گیٹ کے سامنے سے گزر کر سڑک پر آتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہیں اور اس خیال کے آتے ہی میرے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت ہونے لگتی ہے۔

ایک بار تو میں اسکول پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ آئی۔ بہانہ یہ تھا کہ میری کوئی ضروری کتاب چھوٹ گئی ہے۔ لے آؤں۔ لیکن دل میں یہ بات تھی کہ وہ ابھی شاید گیٹ پر ہی کھڑا ہو، اسے ایک بار پھر دیکھ لوں۔ لیکن جب میں سڑک کے موڑ سے ادھر مڑی اور گیٹ پر نظر ڈالی تو میرا دل ایک دم ٹوٹ گیا۔ وہ وہاں نہ تھا۔ میں وہیں سے الٹے قدم اسکول کی طرف لوٹ گئی اور سارا دن میرا رونے کو جی چاہتا رہا۔ لیکن اب میری کوئی بھی تو ایسی دوست نہیں جس کے ساتھ میں لپٹ کر رو سکتی۔ اور اس گھڑی مجھے نزہت بڑی یاد آئی۔ اسکول سے گھر پہنچی تو میرا من بھاری تھا۔ شام تک اداس بیٹھی رہی۔ ستار کے نغمے کو بھی سننے کو جی نہ چاہا۔ اسکول کا کام کرنا تھا لیکن میں نے کتاب کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ جب رات ڈھلنے کے بعد گھڑی نے گیارہ بجائے ستار کی آواز اور صاف کیا مجھے نیند نہ آئی تو تکیہ پر سر رکھے سوچتی رہی۔ رات گئے مجھے اداسی کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔

اور رات جب سامنے کی کھڑکی سے کمرے میں بھی روشنی نظر آئی اور پھر سگریٹ کے دھوئیں کے بادل نظر آئے تو میرا من کھل اُٹھا اور جب کچھ دیر بعد ستار کے تار جھنجھنائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کمرے کے کونے میں رکھا ہوا ستار آپ سے آپ بج اٹھا ہو اور سنگیت کی لہریں میرے آس پاس منڈلا رہی تھیں۔

بھگوان یہ کیا مصیبت ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کہیں میں سچ مچ پاگل تو نہیں ہو رہی؟ میرے ڈیڈی بھی کیوں نہیں میرا خیال کرتے۔ سب کی مائیں اپنی لڑکیوں کی الجھنوں کا خیال کرتی ہیں۔ میری ممی بس ہر کسی کے کپڑے پہننے، ڈیڈی سے جھگڑنے اور ہمیں ڈانٹنے کے سوا اور کچھ نہیں سوچتی۔ میں تو اس گھر میں اپنے آپ کو یتیم سمجھنے لگی ہوں اور یہ احساس ننھی کو بھی ہونے لگا ہے۔ اس طرح کے سلوک سے تو بہتر ہے کہ ہم دونوں کو کسی یتیم خانے میں داخل کرا دیں۔ ممی اور ڈیڈی کے سر سے بوجھ اتر جائے گا اور ہمیں یہ بھی احساس نہ رہے گا کہ ہم ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہیں۔

لیکن یہ سامنے والا سرخ مکان ہی اگر خالی ہو جائے تو میری آدھی پریشانی کم ہو جائے۔ ان دنوں مجھے نیرا بہت یاد آتی ہے۔ وہ یہاں ہوتی تو شاید اپنی الجھنوں کا ذکر اس سے کر سکتی۔ اپنے من پر پڑے اس انجانے بوجھ کو سنبھالنا اب مشکل ہو گیا ہے۔ کبھی تو سوچتی ہوں نیرا کو لکھ دوں سب کچھ۔ لیکن اُسے لکھوں گی بھی کیا؟ کوئی بھی تو بات نہیں لکھنے کی۔ ڈیڈی ممی کے بارے میں لکھوں؟ یہ کتنی بُری بات ہے؟ اس مکان میں آنے والے اس نئے کرایہ دار کی بات اُس سے کہوں۔ یہ کونسی کہنے کی بات ہو گی۔ میرے دماغ میں بھی تو کوئی بات صاف نہیں۔ سب کچھ الجھا ہوا ہے۔ اُسے کیا سمجھ میں آئے گی۔ نہیں نیرا کو لکھنا بیکار ہے۔

پچھلے دو ایک دن سے موسم اچھا نہیں ہے۔ سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ شام ہی سے سرد ہوا چلنے لگتی ہے۔ لوگ دروازے بند کر کے اندر پڑے رہتے ہیں۔ ڈیڈی ممی اندھیرا ہوتے

بچے ہمیں کھانا کھلا کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ میں اور بنٹی بھی اپنے اپنے بستر میں دبک جاتے ہیں۔ نیچے سامنے والے مکان کی بڑھیا اپنی بیمار [illegible] آگ تاپتی رہتی ہے اور اپنے لڑکے کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ مجھے بستر میں آ لگتا ہے بیچاری بڑھیا پر اور اس کا چھوکرا ایسا بے پروا ہے کہ اس موسم میں بھی رات کو وقت سے گھر نہیں آتا اور آتا ہے تو بارش کی رم جھم میں بھیگتا ہوا آتا ہے اور پھر شاید گرم پانی سے نہاتا ہے اور لوہے والے کمرے میں جا کر کپڑے بدلتا ہے۔ سگریٹ پیتا ہے اور کبھی رات تک ستار بجا بجا کر دوسروں کو پریشان کرتا ہے۔ وہ دوسروں کو پریشان کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن میری جان تو اس نے عذاب میں ڈال رکھی ہے۔

کل بہت بارش تھی۔ بجلی بار بار کڑک رہی تھی۔

بنٹی کو سردی لگ رہی تھی۔ میں نے اسے خود ہی بستر میں آجانے کو کہا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہ جانے کیوں اتنے ٹھنڈے رہتے ہیں۔ بے چارے کے پاس گرم جراب بھی تو نہیں۔ سویٹر بھی تو پرانا ہو گیا ہے۔ ممی کہتی ہیں کہ اون بہت مہنگی ہو گئی ہے اس لیے بنٹی کے لیے نیا سویٹر اگلے سال بنے گا۔ میں سوچتی ہوں اگر وہ اپنے بناؤ سنگھار پر خرچ گھٹا دیں تو بنٹی کے ایک نیا دو سویٹر بن سکتے ہیں۔ لیکن کیسے کہتی۔ کون اپنے نصیحت مول لے۔ بنٹی کو اس طرح ٹھٹھرتے دیکھ کر مجھے رونا آگیا۔ میں [illegible] تو وہ ساری رات یونہی ٹھٹھرتا رہتا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور پھر [illegible] اور وہ سو گیا۔ میں [illegible] بستر میں بیٹھی [illegible] ستار بجا رہا تھا [illegible]
[illegible]

سردی کی وجہ سے [illegible] ابھی نہیں [illegible] گئی۔ [illegible] سے میں نے [illegible] پر [illegible] سے [illegible] میرے [illegible] لگ گئے اور مجھے [illegible] کیوں ہو [illegible] کوئی وجہ نہیں؟ وہ [illegible] ہے جو مجھے [illegible] نہیں۔ لیکن پھر بھی [illegible]

کو چاہتا ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ میں یہ سوال کس سے کروں؟ کون مجھے ان سوالوں کا جواب
دے گا؟

طبیعت اچھی نہیں تھی لیکن آج گھر میں پڑے رہنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ آسمان صاف
ہو گیا تھا۔ چاروں طرف دھوپ بھی نکل آئی تھی۔ گلی محلے کے مکان دھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سامنے
والا سرخ مکان تو جیسے ایک دم نیا معلوم ہونے لگا تھا۔ جیسے رات کی رات میں تعمیر ہوا ہو!
اُس کا آنگن بھی پیارا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ اپنے دروازے سے نکل کر سیڑھیاں
اتر رہا تھا اور اُس کے سگریٹ کا دھواں دُھلے ہوئے ماحول میں بے حد پیارا اور خوبصورت
معلوم ہو رہا تھا۔ اُس وقت میں اپنے گیٹ سے باہر نکلی تھی۔ میں جب گلی سے گزر رہی تو وہ
گیٹ پر کھڑا تھا۔ اس نے نہ جانے کیوں ایک دم میری طرف دیکھا۔ بہت ہی بھرپور نظروں
سے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ کی کتابیں لرزنے لگی تھیں۔ میرے قدم ڈگمگا گئے۔
اور میرا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ گڑھا پانی سے بھرا تھا۔ میری شلوار بھیگ گئی۔ ہاتھ سے چھوٹ کر
ایک کتاب بھی۔ وہ گیٹ سے نکل کر ایک دم آگے بڑھا۔ اس نے پانی میں گری ہوئی کتاب کو اٹھایا اور
اپنے سفید کرتے سے پونچھنے لگا۔ اُس کے کپڑے خراب ہو گئے۔ اُس نے کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی۔

اُس سنسان گلی میں اس حادثے نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

"تھینک یو۔" میں نے کتاب سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آئندہ پڑھنے نہ جایئے۔ ہر طرف اب تو کیچڑ ہوگا۔" وہ بولا اور پھر آدھ پیا سگریٹ گلی کی
ایک طرف پھینک دیا۔

میں کچھ نہ بولی۔ ایک لفظ بھی نہیں۔

"آپ کہاں پڑھتی ہیں؟"

میں اب بھی کچھ نہ بول سکی۔ صرف اپنے مکان کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور واپس لوٹ
پڑی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی نگاہیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔

میں اب گھر واپس آ گئی ہوں اور بستر میں پڑی ہوں۔ مجھے بہت تیز بخار ہو گیا ہے اور عجیب عجیب سے سپنے آ رہے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے سامنے والے سُرخ مکان کی اوپر والی کھڑکی میں نیرا کھڑی مسکرا رہی ہے۔ کمرے کے اندر اس کا نیلا دوپٹہ جھول رہا ہے۔ نیرا کی مسکراہٹ کے ارد گرد دھوئیں کے بادل ہیں، جیسے سگریٹ کا دھواں ہو۔ لیکن نیرا کیا سگریٹ پیتی ہے۔ تو یہ کس کے سگریٹ کا دھواں ہے؟ میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔ یہ کون دبا رہا ہے میرا سر؟

ممی؟

نہیں!

ڈیڈی،

نہیں تو!

پنی؟

ارے نہیں!

نیرا؟

وہ بھی تو نہیں!

تو یہ کون ہے؟

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میرے سر کے گرد دھواں سا پھیل رہا ہے۔ ستارے سے تر تر جھنجھنا رہے ہیں۔ یہ پلنگ جھولا سا بن گیا ہے۔ کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟ بھگوان میری رکشا کرنا!

اور پھر میں نے دیکھا آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ کمرے میں سفید کُرتا پاجامہ پہنے ایک آدمی میری کھاٹ کے قریب بیٹھا مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا!!

میرے سامنے سُرخ مکان اُبھر آیا —!

ہیروں والا فقیر

پانچ سال پہلے کی بات ہے

بہت دنوں سے گھر میں اس معاملے پر بحث ہوتی رہتی تھی کہیں تو اپنا ایک مکان بنانا چاہیئے۔ بہت بڑی کوٹھی نہ سہی لیکن سر چھپانے کے لئے چھوٹا موٹا ٹھکانا تو ہونا ہی چاہیئے۔ شہر شہر میں زمین خریدنا اب کسی اوسط درجے کے آدمی کی بات نہ تھی۔ زمین کے وہ ٹکڑے جو دس برس پہلے آٹھ دس ہزار میں مل جاتے تھے اب اُن کی قیمت ایک لاکھ کے قریب تھی اور ایک معمولی سے سرکاری افسر کے لیے ایک لاکھ کی رقم اکٹھی کرنا ایک نسل کی بات نہیں تھی کہیں دو چار نسلوں میں اتنا سرمایہ جمع ہو جائے تو کہا نہیں جا سکتا کیونکہ آنے والی نسلوں کا معاملہ تھا۔ جب اپنی ہی اولاد کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تو آنے والی نسلوں کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ ایٹم بموں کا زمانہ اور آئندہ کی دو چار نسلوں کی بات۔ بہت بڑا مذاق ہے انسانی زندگی کے ساتھ۔ اور میں ذرا سنجیدہ قسم کا آدمی ہوں۔ مذاق وذاق میں کم دلچسپی رکھتا ہوں تو فیصلہ یہی ہوا کہ اس نسل کی [illegible] کی جائے اور چند ہی گھڑیوں میں زمین خریدنے کا خیال ترک کر دیا جائے اور کسی دوسرے درجے قسم کے شہر میں جس کے پھیلنے اور پھولنے کے امکانات زیادہ ہوں زمین خریدی جائے۔ اب اس قسم کا شہر تلاش کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔ اچھا خاصہ سروے کرنے کی ضرورت تھی۔ میرے بس کی تو یہ سروے نہیں تھی چنانچہ مجھے اس کام کے لیے نااہل سمجھا گیا اور شہر تلاش کرنے

"مکان بنانے کی اتنی جلدی بھی کیا ہے، کچھ دیر کے بعد شروع کروا دینا۔"

"لیکن جس رفتار سے سیمنٹ اور لوہے کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں اسے دیکھتے ہوئے تو دیر نہیں کرنا چاہیے۔" ارادھنا بولی۔

"زمین خرید لی ہے تو مکان شروع ہی کروا دینا چاہیے۔" شانتی جو کچھ دیر سے خاموش تھی بولی۔

"تو مجھے بکوا دو۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"بھائی صاحب انشورنس والوں سے قرضہ مل سکتا ہے۔ کچھ قرضہ آپ سرکار سے بھی لے سکتے ہیں۔"

"واپس جا کر دیکھوں گا۔" میں نے سریندر کی بات کا جواب بڑے سلیقے سے دیا۔

اگلے دن میں اور شانتی چنڈی گڑھ آ گئے۔ میں نے مکان کی تعمیر کے لیے قرضے کے لیے درخواست دے دی۔ معلوم ہوا کہ بڑی لمبی فہرست تھی۔ قرضہ اس سال نہ مل سکے گا۔ شانتی کے بار بار اصرار کرنے پر میں نے کوئی دو ہفتے بعد پانچ ہزار کا ڈرافٹ سریندر کو بھیج دیا۔ سریندر نے لکھا کہ پانچ ہزار کا وہ خود انتظام کرے گا۔ اور سیمنٹ اور لوہا خرید لے گا۔

[illegible] سرکار نے [illegible] شروع کر دی اور دو سال کے لیے ایسے ترقی پذیر رنگ [illegible] دو سال کے لیے معاملہ التوا میں پڑ گیا۔ اس بیچ میں مکان کے لیے خریدا ہوا سامان دو ایک بار رکھا ہوا کئی بار فروخت بھی ہو گیا۔ مجھے اس قسم کی اطلاع سریندر نے دی تھی۔ اور پھر اس نے لکھا کہ فہرست والے پلاٹ کے عین سامنے سڑک کے اُس پار جو ایک دو کنال کا پلاٹ تھا اس نے اپنے مکان کے لیے خرید لیا تھا اور پھر ایک دن ارادھنا چنڈی گڑھ آئی تو اس نے شانتی سے کہا۔

"سڑک کے دونوں کناروں پہ ہمارے مکان ہوں گے۔ ایک طرف آپ کا۔ اور دوسری طرف ہمارا۔"

میں نے ارادہ کر لیا کہ اب مکان کے لیے قرضہ لینے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ دو ایک دوستوں نے کہا بھی کیس سپیویر ہو چکا ہے۔ اس سال کے ختم ہونے سے پہلے قرضہ مل جائے گا۔

لیکن ابھی دس دن پہلے ایک اور بات ہو گئی۔

سُریندر کا خط آیا تھا کہ وہ اتوار کو پورن ماشی کے دن اپنا مکان شروع کرا رہا ہے۔ دیواروں کی نیو رکھی جا رہی ہے۔ مجھے، شانتی اور بچوں کو بلایا تھا۔ میں نہیں جا سکا۔ مجھے کہیں دورے پر جانا تھا۔ شانتی اور بچے گئے تھے۔ میرا بڑا لڑکا پردیپ بڑا حساس قسم کا چھوکرا ہے۔ ہے تو وہ بی، اے فرسٹ ایئر میں ہی لیکن ہے بہت ذہین۔ کبھی کبھی کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے کہ میں ڈر جاتا ہوں کہیں وہ بھی انہیں راستوں پر تو نہیں چل نکلے گا جن کی منزلیں بھٹک جایا کرتی ہیں۔

پردیپ واپس آیا تو بڑا ڈسٹرب تھا۔

"انکل بڑی شاندار کوٹھی بنوا رہے ہیں۔"

"شاندار کوٹھی کے لیے رقم بھی تو شاندار چاہیے بیٹا۔"

"اس کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ صرف بے کار کہانیاں لکھنے سے رقم حاصل نہیں ہوتی۔" پردیپ کی ماں کا ترش جواب تھا۔

"کم سے کم اس ملک میں نہیں ہوتی۔" میں نے کہا

"یہاں بھی ہو سکتی ہے۔" اس نے کھینچ کر کہا۔

"کس طرح؟"

"محنت کرنے سے۔" شانتی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا اور میں ہنس دیا۔

"آپ سوائے ہنسنے کے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"رو بھی سکتا ہوں، دوسروں کے دکھوں پر اوروں سے کی گئی ناانصافیوں پر۔"

"کبھی میرے دکھوں پر بھی رونا آیا ہے آپ کو؟" شانتی نے بڑی کڑواہٹ سے

پوچھا۔
"بہت بار جب میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ایک ادیب بننے کی بجائے ایک معمولی سا دوکاندار بن جانا چاہئے تھا۔"
"نہ آپ نہیں بن پائیں گے ڈیڈی" پردیپ اب زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکا۔
میں نے بات کا رخ موڑنے کے لیے اُس سے پوچھا۔
"تم نے اپنا پلاٹ بھی دیکھا تھا۔؟"
"دیکھا تھا ڈیڈی"
"کیسا لگا؟"
"پلاٹ تو خیر سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن اُس میں اُگے بیریوں کے درخت ہی خوبصورت لگ رہے تھے۔ محلے کے چھوکرے پتھر مار مار کر پکے ہوئے بیر گرا رہے تھے، بہت ہی میٹھے بیر ہیں ڈیڈی۔"
"پڑوسیوں کی بھینس نہیں بندھی تھیں وہاں کیا؟"
"بھینس بھی بندھی تھی، چھوکروں کے پتھر پھینکنے سے بدکنے لگی تو پڑوس سے باہر آ کر ڈانٹا تھا، بولی جس کی بیریاں ہیں وہ یہاں نہیں ہے ورنہ تمہاری ٹانگیں توڑ دیتا۔"
میں پردیپ کی بات سُن کر ہنس پڑا، اس کی ماں ناراض ہو گئی اور پھر آپ اسے اُٹھ کر کچن میں چلی گئی۔
"تمہاری ممی کہتی ہیں مکان فوراً شروع کرانا چاہیئے۔ اب تو مجھے چالیس ہزار قرضہ بھی مل رہا ہے سرکار سے۔"
"نہیں ڈیڈی اس پلاٹ میں مکان مت بنوانا۔"
"کیوں؟"

"وہ خوبصورت بیریاں کٹ جائیں گی۔" شانتی سُن رہی تھی وہ لپک کر کمرے میں

"تم دونوں اپنی کٹیا بنوا لو اُن بیریوں کے نیچے، بیریوں والا فقیر، بیریوں کی
میں ہی ڈیرا جمائے۔"

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ لمحہ بھر بعد پردیپ کا قہقہہ بھی میرے قہقہے
میں شامل ہو گیا۔ شانتی ہم دونوں کو ٹُکر ٹُکر دیکھ رہی تھی جیسے ہوش مند لوگ دیوانے فقیروں
کو تکتے ہیں۔